14173

140.

نگار

قیمت فی کاپی ۱۰ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا ہر افسانہ اور ہر مقالا اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت چار روپیہ

علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جسمیں تاریخ اور انشا لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں، حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

مختارات نیاز

حضرت نیاز فتحپوری کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ، اس میں اکثر و بیشتر وہ افسانے شامل ہیں جو دوسری زبانوں سے لئے گئے ہیں اور اپنی دلچسپی و افادیت کے لحاظ سے خاص درجہ رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ دوسرے زبانوں کے افسانے کیونکر اپنی زبان میں لینا چاہئے کہ وہ ترجمہ نہ معلوم ہوں، مجلد، نہایت عمدہ طباعت و کاغذ، نفیس گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ

مکتوبات نیاز

دو حصوں میں

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل نئی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، اس اڈیشن میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت ہر حصہ تین روپیہ

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشا عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار و جواب

(حصہ ۲ - ۳)

اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بے کار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ

علاوہ محصول

جھانسی کی رانی

نیاز فتحپوری کے قلم سے اس ڈرامہ سے نہ صرف ۱۸۵۷ء کے ان واقعات پر روشنی پڑتی ہے جو ہندوستان میں برطانوی راج کے قیام کا باعث ہوئے، بلکہ راجاؤں کے ان اندرونی اختلافات کا بھی حال معلوم ہوتا ہے جو ملک کو غیر ملکیوں کے ہاتھ میں دیدینے کا بڑا سبب تھے اس ڈرامہ کے وہ حصے خصوصیت کے ساتھ بہت دلچسپ ہیں جن میں رانی کی زندگی کے آخری لمحات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ

اصحاب کہف

یہ ڈرامہ ایک مصری انشا پرداز "توفیق الحکیم" کی کتاب "اہل الکہف" کا ترجمہ ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے نہایت لطیف انداز سے "اصحاب کہف" کی روایت پر عاقلانہ تبصرہ کیا ہے، اس تمثیل کی جان وہ حصہ ہے جہاں موضوع محبت پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کی ابدیت کو بالکل اچھوتے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ترجمہ حضرت نیاز نے کیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ

فاسد مادہ کے بغیر
جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے
خون صاف رکھنا نہایت ضروری ہے

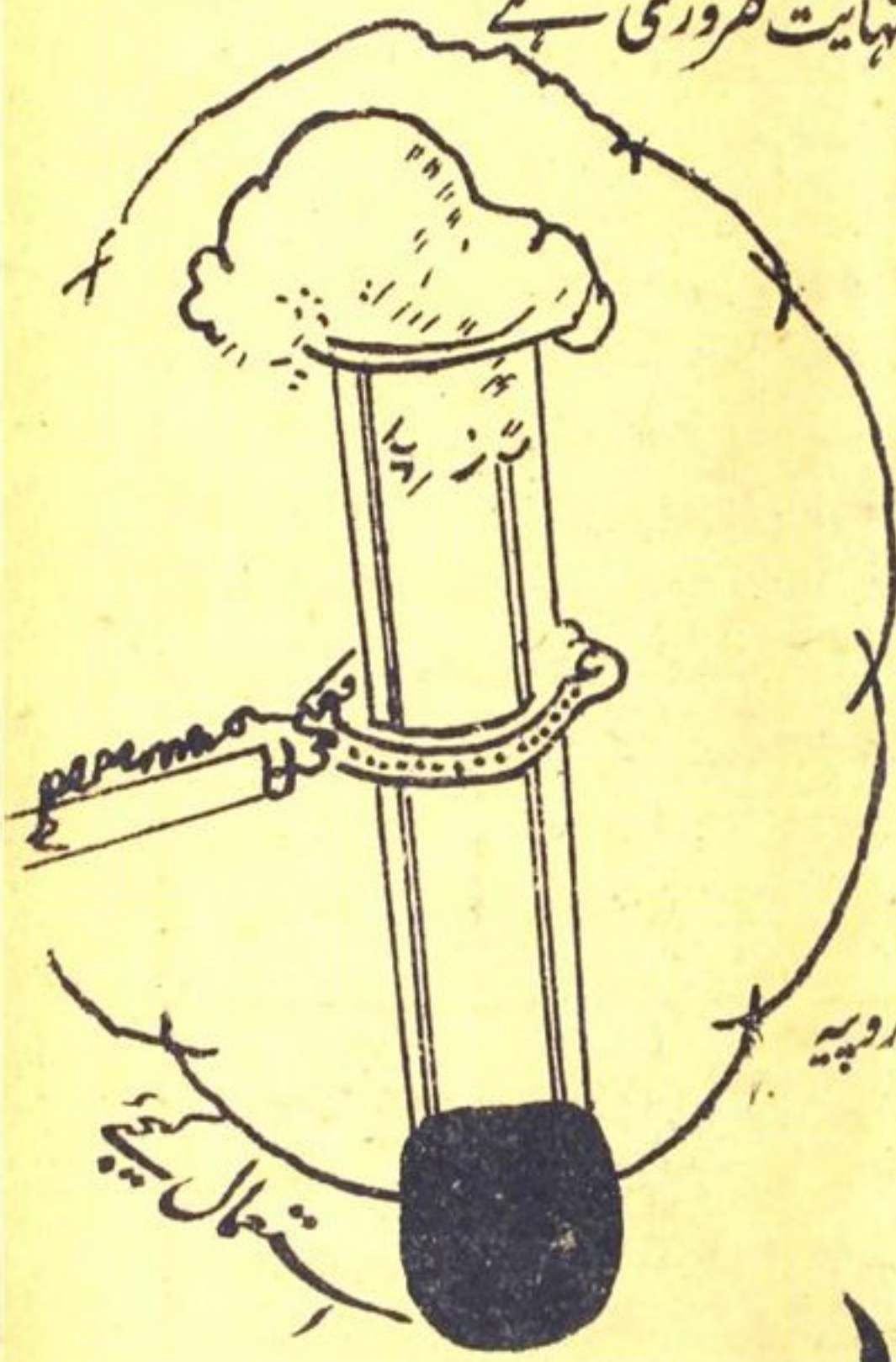

قدیم یونانی نظریہ کی تائید میں جب ڈاکٹر اسپیکو فریر وفیسر دیانا یونیورسٹی نے فیصلہ کر لیا کہ مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے تو ایک دن انھوں نے ایک عجیب وغریب مظاہرہ کیا وہ کلاس پڑھا رہے تھے، اُنکے ہاتھ میں ایک ٹیسٹ ٹیوب تھی جس میں ہیضہ کے زندہ جراثیم موجود تھے جو ایک پوری رجمنٹ کو ہلاک کرنے کے لئے کافی تھے۔ ڈاکٹر نے ان سب جراثیم کو نگل لیا مگر اس خطرناک تجربہ کا نتیجہ سوائے ہلکی سی تکلیف کے اور کچھ نہ ہوا، آخر کیوں؟ ہیضہ کے زندہ جراثیم نے ڈاکٹر کو ہلاک کیوں نہیں کر ڈالا! صرف اس لئے کہ ڈاکٹر کا خون فاسد مادوں سے صاف تھا

اور یہی ڈاکٹر کا دعویٰ تھا

یقیناً جراثیم کو مارنا قطعاً غلط ہے، اصل چیز جسم وخون کو فاسد مادوں سے صاف رکھنا ہے۔ **صافی** اسی اُصول کے پیشِ نظر طیار کی گئی یہ خون کو صاف رکھتی ہے اور جسم کی قوت مدافعت کو مرض کے خلاف قوی رکھتی ہے۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ

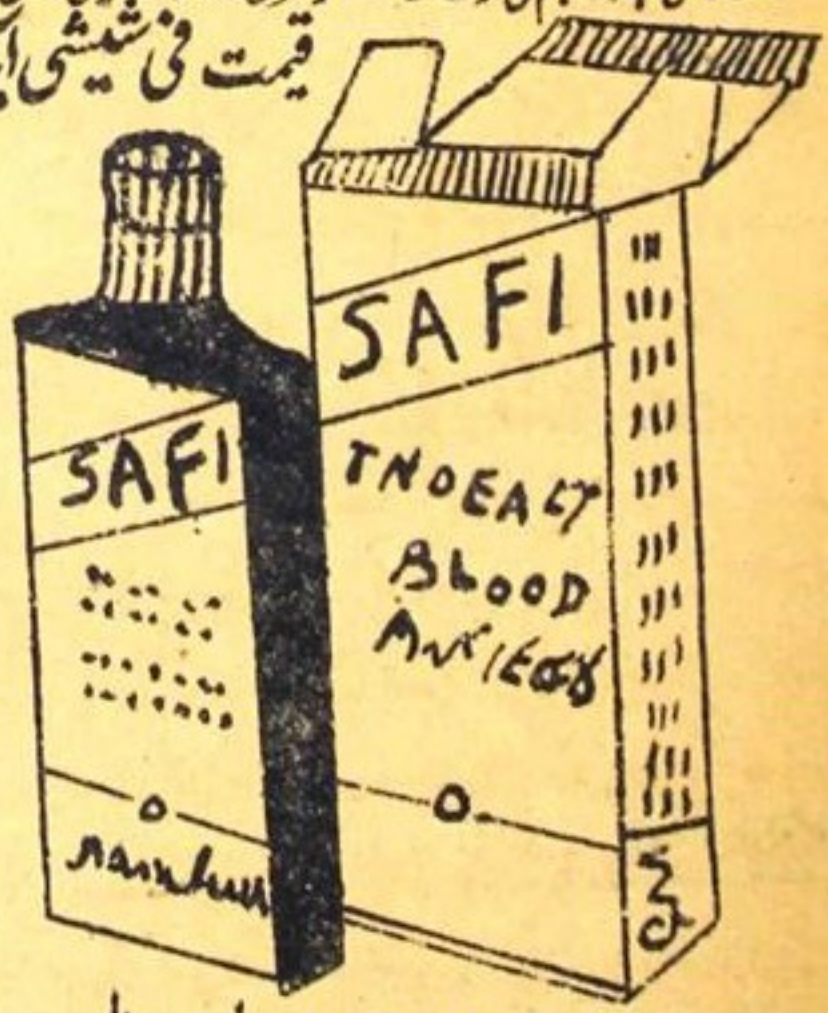

صافی

Hamdard

ہمدرد دواخانہ دہلی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں

چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دنیا آجکل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کرکے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ، مشکی قوام، دانہ الائچی، تیل، عطر، عرق کیوڑہ وگلاب اور مختلف قسم

کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا

مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام: "مشکی قوام ہوڑہ" ٹیلی فون: "ہوڑہ ۴۵۵"

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری۔ ۱۴۱ ہوڑہ روڈ۔ ہوڑہ

سالانہ چندہ : چھ روپیہ ہندوستان کے لئے

نگار

بیرونِ ہند کے لئے بارہ روپیہ

جلد ۵۳ | فہرست مضامین جون ۴۸ء | شمار ۶

ملاحظات ---------- ۴
فانی میری نظر میں ---- وحیدالدین خاں ---- ۹
فلسطین کے مسئلہ میں روس و امریکہ کی ریشہ دوانیاں ---- ۲۱
لکھنؤ اور دہلی کی شاعری --- محمد باقر شمس --- ۲۶
خاموش آواز ---------- ۴۰
منیر شکوہ آبادی ---- محمد عظیم ---- ۴۲
یزدانیوں کی روشنگافیاں ... سید اختر علی تلہری ---- ۵۱
دلچسپ معلومات ---------- ۶۲

حضرت نیاز فتحپوری کی ایک بے مثل تصنیف

"من و یزداں"

جو اپنی انشاء عالیہ اور پر زور خطیبانہ تحریر کے لحاظ سے معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتی ہے — اور اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے اتنی بلند ہے کہ اُسے صحیح معنے میں

انجیلِ انسانیت

کہہ سکتے ہیں

اس میں مذاہب کی تخلیق، خدا کے تصور، رسالت کے مفہوم، دینی عقاید اور کتب الہامی کی حقیقت پر بسیط تاریخی علمی، نفسیاتی اور اخلاقی بحث کی گئی ہے — حجم ۲۰۲ صفحات — کاغذ سفید و دبیز۔ جلد خوشنما۔

قیمت علاوہ محصول سات روپیہ آٹھ آنے (۷ر۸)

منیجر نگار لکھنؤ

ضروری اعلان

پاکستان کے خریدار نگار مہینے کی ۲۸ تک انتظار کرنے کے بعد پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع دیں۔ کیونکہ پاکستان کے اکثر مقامات پر بہت دنوں میں ڈاک پہونچتی ہے۔

نگار

آئندہ جولائی کا نگار خاص چیز ہوگا اور اپنے مضامین کی دلکشی و تنوع کے لحاظ سے گویا سالنامہ ہوگا۔

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۵۳	جون ۴۸ء	شمار ۶

ملاحظات

کشمیر

اس وقت کشمیر و حیدر آباد کے معاملات نے ہندوستان کی سیاسیات میں کافی پیچیدگیاں پیدا کر رکھی ہیں اور ان کے سلجھنے کے بظاہر کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

حکومتِ ہند نے کشمیر کے مسئلہ کو حفاظتی کونسل میں اس لئے پیش کیا تھا کہ شاید وہاں کوئی صورت باہمی سمجھوتے کی پیدا ہو جائے گی، لیکن کونسل اس وقت تک کوئی ایسی راہ پیدا نہیں کر سکی جو ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لئے قابل قبول ہو۔

اس وقت شیخ عبداللہ کی حکومت کشمیر میں برسرِ اقتدار ہے، لیکن پاکستان اس کو غاصبانہ حکومت کہتا ہے اور اصل مستحق ایک دوسری جماعت کو قرار دیتا ہے جو برسرِ اقتدار نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سرزمینِ کشمیر اپنی جائے وقوع کے لحاظ سے اس قدر اہم ہے کہ ہندوستان و پاکستان دونوں کو قدرتاً اسے اپنے ساتھ ملانے کی خواہش ہونا چاہئے۔ لیکن چونکہ اس کا فیصلہ نہ ہندوستان کے ہاتھ میں ہے نہ پاکستان کے بلکہ خود اہلِ کشمیر ہی کے ہاتھ میں ہے، اس لئے اس باب میں ان کی رائے حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور اس وقت اصل جھگڑا یہی ہے کہ یہ رائے شماری کیونکر ہو۔ پاکستان کہتا ہے کہ جب تک ہندوستان کی فوجیں وہاں سے نہ ہٹ جائیں اور شیخ عبداللہ کی حکومت کو معطل نہ کر دیا جائے، وہاں کی آبادی کی صحیح رائے معلوم نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ موجودہ حکومت اپنے حق میں رائے حاصل کرنے کے لئے اثر و دباؤ سے کام نہ لے۔ ہندوستان کا عذر یہ ہے کہ جب تک سرحدی حملہ آوروں کی طرف سے اطمینان نہ ہو جائے

اور پاکستان کو ان حملوں کی طرف سے مطمئن نہ کر دے وہ اپنی فوجیں ہٹانے کے لئے آمادہ نہیں۔ حفاظتی کونسل نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ رائے شماری اس کی نگرانی میں ہو، لیکن اس فیصلہ کو عملی صورت میں لانے کے لئے فریقین کو جن مبادیات سے گزرنا ہے وہ نہ تو ابھی تک طے ہو سکے ہیں اور نہ ان کے ماننے کے لئے کوئی طیار ہے اس لئے جب تک ہندوستان و پاکستان خود ہی مل کر کوئی صورت مفاہمت کی پیدا نہ کریں :: جھگڑا طے نہیں ہو سکتا۔

یقیناً ہندوستان اس کو پسند نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی حدود سے باہر غیروں کے لئے محض قیام امن کی خاطر لاکھوں روپیہ روز کے فوجی مصارف برداشت کرتا رہے اور نہ پاکستان اسے پسند کر سکتا ہے کہ سرحدی قبایل کے حملوں کی وجہ سے یہ مسئلہ عرصہ تک التوا میں پڑا رہے، لیکن دشواری یہ ہے کہ اگر ہندوستان اپنی فوجیں وہاں سے ہٹا بھی لے تو شیخ عبداللہ کی حکومت کو معطل کر دینا اس کے اختیار سے باہر ہے اور پاکستان سرحدی قبایل کو کشمیر کی طرف جانے سے اگر روکنا چاہے بھی تو نہیں روک سکتا۔ اس لئے سوال صرف ہندوستان و پاکستان کا نہیں بلکہ ایک تیسرے فریق کا بھی ہے جو کسی شرع و آئین کا پابند نہیں اور جس کا مقصود زیادہ تر غارتگری ہے۔ برطانوی حکومت کے زمانہ میں بھی یہ عنصر اسی طرح خود سر و سرکش تھا اور فوج سے زیادہ روپیہ کی مدد سے اس کو ابھرنے سے باز رکھا جاتا تھا، لیکن اب کہ پاکستان کے پاس نہ اتنا روپیہ ہے کہ اس کے جذبۂ طمع و حرص کو پورا کر سکے اور نہ اتنا زور بازو کہ کلہ بہ کلہ جواب دیکر اسے ختم کر دے اسلئے ہندوستان کو اس ذمہ داری کا سارا بوجھ پاکستان پر ڈالنا قرین عقل و انصاف نہیں۔

پاکستان صاف صاف کہہ چکا ہے کہ سرحدی قبایل پر اس کو اختیار حاصل نہیں اور نہ وہ ہمالیہ کے ان تمام دروں کی ناکہ بندی کر سکتا ہے جہاں سے یہ لوگ حدود پاکستان میں داخل ہوتے رہتے ہیں، اس لئے یہ مسئلہ آپس کی خط و کتابت کے بیچ سے طے نہیں ہو سکتا، اور ضرورت ہے کہ فریقین واقعی خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کی دشواریوں پر غور کریں اور باہم ملکر کھلے دل سے گفتگو کر کے کسی نتیجہ پر پہونچیں۔

اس سلسلہ میں ایک آواز پٹھانستان کے قیام کی بھی کانوں میں آ رہی ہے اور ہر چند یہ آواز ابھی کمزور ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس آواز پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے اور پٹھانستان کے قیام بھی تجربہ کرنے کی چیز ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اگر تمام قبایل کے سرداروں سے ملکر گفتگو کی جائے اور خالص پٹھانوں کی ایک مستقل خود مختار حکومت تسلیم کر لی جائے تو غالباً یہ جدید تاخت کے اندیشے جاتے رہیں۔

اسوقت ہندوستانی فوجوں کو کشمیر میں کامیابی ہو رہی ہے، لیکن یہ کامیابی عارضی ہے اور موسم سرما شروع ہونے پر سرحدی جتھے پھر پریشان کریں گے، اس لئے ضرورت ہے کہ اسی دو تین مہینے کے اندر کوئی نہ کوئی صورت مفاہمت کی پیدا کر لی جائے، ورنہ یہ مسئلہ پھر مہینوں کے لئے الجھ کر رہ جائے گا اور ہندوستان و پاکستان کے تعلقات میں کشیدگی بڑھنے کے امکانات اور زیادہ قوی ہو جائیں گے، حالانکہ ہماری اور سب کی انتہائی تمنا صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ان دونوں ملکوں کے تعلقات خوشگوار رہیں اور

ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو دوسرے کا جزو لازم سمجھے۔

کرۂ ارض کا نیا نقشہ

جنگ ختم ہوئے تین سال ہو چکے ہیں اور اس دوران میں دُنیا کے نقشہ میں عجیب و غریب تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں بھی کچھ تبدیلیاں ہوئی تھیں، لیکن ان کی معنوی حیثیت زیادہ اہم نہ تھی۔ اب اس جنگ کے بعد جو تغیرات ہوئے ہیں وہ بہت زیادہ اہم ہیں اور آیندہ کے لئے بھی عظیم الشان تغیرات کا پیش خیمہ ہیں۔

سب سے اہم تغیر اس جنگ میں یہ ہوا کہ روس، جس کا اثر یورپ میں مطلق نہ تھا اس کا دسترس اب نہ صرف وسط یورپ بلکہ اٹلی و فرانس تک پہونچ گیا ہے اور تمام یورپ کے اقتصاد و سیاسیات، کلچر اور ذہنیت پر اس کا اثر پڑ رہا ہے۔

دوسرا اہم تغیر یورپ میں یہ ہوا کہ پولینڈ، یورپ کا ٹکڑا ہو گیا اور جرمنی کا رقبہ بہت تنگ کر دیا گیا، اور دوسرے ملکوں کے حدود میں بھی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

مشرق میں اہم ترین تغیر جاپان کے نقشہ میں ہوا ہے، پہلے وہ بحر پاسفک میں دور دور تک پھیلا ہوا تھا، لیکن اب صرف اس کے ساحل کے پاس کے چند جزیرے اس کے پاس رہ گئے ہیں، باقی جزایر اُنکے اصلی مالکوں کو دیدئے گئے ہیں۔

مشرق میں برطانوی، فرانسیسی اور ڈچ سلطنتوں کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ ہندوستان و برما انگریزوں کے ہاتھ سے نکل چکے اور فرانس و ہالینڈ کی گرفت بھی مشرقی مستعمرات پر بہت ڈھیلی پڑ گئی ہے۔

ان تغیرات کا اہم ترین نتیجہ یہ ہوا کہ جو ملک آزاد ہوئے ہیں ان پر اپنا اپنا اثر قایم کرنے کے لئے روس و امریکہ دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور اشتراکیت و جمہوریت کے درمیان تصادم کے امکانات زیادہ قوی ہو گئے۔

چونکہ دُنیا کے معاملات میں خلا محال ہے اس لئے امریکہ ان ملکوں میں داخل ہونا چاہتا ہے، جنھیں دوسروں نے خالی کر دیا ہے، اس لئے اس کی فوجی و سیاسی حدود مشرق ادنیٰ میں یونان و ترکی تک، مشرق وسطی میں عرب و ایران تک مشرق بعید میں چین، کوریا اور جاپانی جزایر تک، اور منطقۂ باردہ (آرکٹک) میں اُٹو تک وسیع ہو گئے ہیں۔

سوویٹ یونین کا رقبہ قبل از جنگ ۸۱۷۳۰۰۰ مربع میل تھا اور آبادی سترہ کرور، اب اس کا رقبہ ۸۴۳۹۰۰۰ مربع میل ہے اور آبادی ۱۹ کرور ۳۰ لاکھ۔ اس نے لیٹویا، اسٹونیا، لتھونیا اور پولینڈ کے ایک بڑے حصہ کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا، اور جرمنی، فن لینڈ، رومانیا اور زیکوسلاویکیا کے بھی کچھ حصے اس نے لے لئے۔ ایشیا میں بعض جاپانی مقبوضات اس کے ہاتھ آگئیں۔

اسی کے ساتھ چونکہ پولینڈ، زیکوسلاویکیا، یوگوسلیویا، البانیا، ہنگری اور رومانیا میں اشتراکی حکومت قایم ہو گئی ہے، اس لئے اب روس کے اثرات کا حلقہ بحر بالٹک سے بحر اڈریاٹک تک وسیع ہو گیا ہے۔

پولینڈ کا رقبہ قبل جنگ ۱۵۰۰۰۰ مربع میل تھا، اس میں سے ۶۹ ہزار مربع میل روس نے لے لیا اور ۴۹ ہزار

مربع میل جرمنی کے علاقہ سے اس کو ملا، اس طرح اب اس کا موجودہ رقبہ ایک لاکھ ۲۰ ہزار مربع میل رہ گیا ہے لیکن اسکا ساحلی علاقہ بحر بالٹک میں زیادہ وسیع ہوگیا اور دریائے وسچولا پر پورا اقتدار حاصل ہوگیا۔ روس نے جو حصہ پولینڈ کا لیا ہے اس میں زیادہ تر سفید روسیوں کی آبادی ہے، یہود آبادی یہاں کی پہلے ہی ہٹلر نے ختم کردی تھی، اب جرمن آبادی کو روس نے نکال دیا ہے۔

انگلستان کو اس جنگ سے کوئی فایدہ نہیں ہوا۔ فرانس کو البتہ اٹلی کی طرف سے کچھ مراعات حاصل ہوئی ہیں، اور سار کا جرمن علاقہ جو کویلہ کی پیداوار کے لحاظ سے بڑا مشہور علاقہ ہے، وہ بھی اسے مل گیا ہے۔

جرمنی کا ایک چوتھائی علاقہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس کے موجودہ علاقہ میں جرمن آبادی اتنی ہی ہے جتنی ۱۹۳۷ء میں تمام جرمن علاقہ میں پھیلی ہوئی تھی، کیونکہ جرمنی کے جو علاقے دوسرے ملکوں کو دئے گئے ہیں وہاں کی جرمن آبادی بھی بھاگ بھاگ کر یہیں پہونچ رہی ہے۔

اٹلی کو اپنا کچھ علاقہ فرانس کو دینا پڑا اور مشرقی اڈیاٹک کے مقبوضات یوگوسلیویا کو۔ جزیرۂ ڈوڈکنیز یونان کے حوالہ کرنا پڑیں اور افریقی مستعمرات اتحادیوں کو۔

جاپان کو اپنی سلطنت چین، روس اور امریکہ کے حوالہ کرنا پڑی اور کوریا، روس اور امریکہ میں بٹ گیا۔

فرانس، انڈوچائنا کی ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ آبادی کو محکوم رکھنے کے لئے جنگ کر رہا ہے، لیکن کامیابی کی کوئی امید نہیں اور انڈوچائنا کی آزادی یقینی ہے۔

انڈونیشیا میں، نیدرلینڈ نے ایک مشترک قسم کی حکومت کا اعلان کیا ہے، لیکن یہاں کی سات کروڑ آبادی اس پر راضی نہیں ہے اور وہ آزادی کے لئے پوری جد وجہد کر رہی ہے۔

افریقہ میں البتہ ابھی تک برطانیہ و فرانس کی قیادت قایم ہے اور ان کے مستعمرات صرف یہیں باقی رہ گئے ہیں لیکن آہستہ آہستہ آزادی کے جذبات یہاں بھی پیدا ہو رہے ہیں اور غالباً بہت جلد برطانیہ و فرانس کو اپنی گرفت یہاں ڈھیلی کرنی پڑے گی۔

فلسطین آخر کار فلسطین میں وہ جنگ چھڑ ہی گئی جس کا اندیشہ تھا اور عرب و یہود کی مخالفت نے وہ رنگ اختیار کر ہی لیا جس کا ڈر تھا۔ برطانوی انتداب کے ختم ہوتے ہی، ایک طرف یہودیوں نے اپنی حکومت کا اعلان کردیا اور دوسری طرف عرب فوجوں نے یروشلم پر تاخت شروع کردی۔

اگر یہود و عرب دونوں لڑنے کے لئے تنہا چھوڑ دئے گئے، تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ غالباً اتنا اہم سوال نہیں، جتنا یہ کہ اس لڑائی کا دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں پر کیا اثر ہوگا۔

اس سلسلہ میں جب ہم امریکہ، برطانیہ اور روس کے طرز عمل کی طرف دیکھتے ہیں، تو ہم کو آثار اچھے نظر نہیں آتے۔

یہاں تک کہ خود برطانیہ و امریکہ کے درمیان بھی ہلکی سی کشیدگی پیدا ہوگئی جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ امریکہ نے یہود ریاست کے وجود کو تسلیم کرلیا اور برطانیہ نے ابھی تک اس کو نہیں مانا۔ علاوہ اس کے برطانیہ کا عربوں کو اسلحہ فراہم کرتے رہنا بھی امریکہ کو پسند نہیں ہے۔ اور اگر امریکہ یہودیوں کو اسلحہ فراہم کرتا رہا اور برطانیہ، عربوں کو تو آیندہ چل کر امریکہ و برطانیہ کی کشیدگی کو یقیناً زیادہ بڑھ جانا ہے۔

کوشش یہ کی جارہی ہے کہ فریقین اس وقت تک لڑائی بند کردیں جب تک حفاظتی کونسل کوئی فیصلہ نہ کردے، یعنی عرب جانتے ہیں کہ ان کی جیت اسی میں ہے کہ وہ یہودیوں کے طیار ہونے سے قبل ہی جو کچھ کرنا ہے کرلیں ورنہ اگر ذرا مہلت بھی یہودیوں کو ملی تو مقابلہ دشوار ہوجائے گا، اس لئے وہ التوائے جنگ کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ اس وقت فلسطین میں مصر، شرق یردن اور عراق کی فوجیں کام کررہی ہیں، ابن سعود ابتک خاموش ہے، لیکن اس کی خاموشی اس لئے نہیں کہ وہ یہودیوں کا موافق ہے، بلکہ وہ صرف موقعہ کا منتظر ہے اور وہ اس وقت حملہ کرے گا، جب فوجوں کی سیادت اسے حاصل ہوجائیگی۔

روس کی طرفداری یہودیوں کے ساتھ پہلے ہی ظاہر ہوچکی ہے اور اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ یہودیوں کو حق پر سمجھتا ہے، بلکہ صرف اس لئے کہ اس طرح اسے مشرقِ ادنیٰ میں قدم جمانے کا موقعہ مل جائے گا، جس کی تمنا وہ عرصہ سے اپنے دل میں لئے ہوئے ہے۔ برطانیہ چونکہ اس سرزمین میں روس کا دخور کسی طرح پسند نہیں کرسکتا، اس لئے وہ زیادہ تر عربوں کی طرف مایل ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر عربوں کو اس نے ناخوش کردیا تو وہ فوراً روس کی طرف مایل ہوجائیں گے اور روس فوراً یہودیوں کی طرفداری چھوڑکر عربوں کی امداد پر آمادہ ہوجائے گا جو برطانوی مفاد و اغراض کے لئے بہت زیادہ منافی ہے۔

امریکہ کے لئے البتہ یہ مسئلہ ذرا پیچیدہ ہے، کیونکہ ایک طرف ٹرومین، امریکی یہودیوں کو خوش رکھ کر (جو امریکہ میں بہت بڑا اثر رکھتے ہیں) اپنے حق میں انکے ووٹ بھی حاصل کرنا چاہتا ہے اور دوسری طرف وہ عرب حکومتوں کو بھی ناراض کرنا نہیں چاہتا کہ مبادا وہ روس کی طرف مایل ہوجائیں اور اسی لئے وہ چاہتا ہے کہ باہمی مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہوجائے، لیکن یہودیوں اور عربوں کے یکدم کرکے صلح ہوجانے کا یقین نہیں کیا جاسکتا اور اگر یہ جنگ طول پکڑ گئی تو روس، امریکہ اور برطانیہ کے باہمی تعلقات کو یقیناً اس سے متاثر ہونا ہے، خواہ وہ تیسری عالمگیر جنگ ہی کا عنوان کیوں نہ ہو۔

حیدرآباد

حیدرآباد کا مسئلہ روز بروز نازک ہوتا جارہا ہے اور حکومت ہند مجبور ہے کہ وہ اس مسئلہ میں اپنی پالیسی کا اظہار جلد سے جلد کردے، اس لئے حیدرآباد کو بھی اب قطعی فیصلہ کردینا ہے کہ وہ حکومت ہند کے مطالبات کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہے یا نہیں اور اگر نہیں ہے تو کیا وہ لڑائی کے لئے طیار ہے اور کیا لڑائی کے عواقب پر اسنے پوری طرح غور کرلیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی تمام ریاستوں میں حیدرآباد کی پوزیشن سب سے جداگانہ ہے اور ہمارے لئے اس سے زیادہ مسرت کی بات اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ خانوادۂ آصفی کا اقتدار بدستور قایم رہے، لیکن اسکا جغرافی موقف اسقدر خراب ہے کہ وہ حکومت ہند سے دوستانہ تعلقات رکھے بغیر اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتا، اسلئے اسکو سوچنا چاہئے کہ موجودہ دورِ آزادی میں جبکہ ذمہ دار حکومت قایم کئے بغیر بڑی سی بڑی سلطنت بھی قایم نہیں رہ سکتی، وہ کیونکر اس اصول سے انحراف کرکے کامیاب ہوسکتا ہے اور اتحاد المسلمین کا جذبۂ قربانی اسے کیا فایدہ پہونچا سکتا ہے۔

فانی میری نظر میں

(جناب ذوقی کے جواب میں)

مارچ ۱۹۴۸ء کے نگار میں "فانی کی المیہ شاعری کے عناصر" کے عنوان سے ایک مضمون شایع ہوا ہے۔ فانی مرحوم کے متعلق عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک ناکام اور مصیبت زدہ انسان تھے اور ان کی شاعری اسی دردناک زندگی کا المیہ ہے، مگر یہ مضمون ہم کو فانی اور ان کی شاعری کا ایک نئے انداز سے تعارف کراتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فانی کا غم در اصل زندگی کا غم نہیں تھا۔ بلکہ یہ ان کی عجیب قسم کی بے چین فطرت کا کرشمہ تھا جو کسی حالت میں ان کو قرار لینے نہیں دیتی تھی۔ صاحب مضمون کے الفاظ یہ ہیں:

"جس غم پر فانی کی شاعری کی بنیادیں قایم ہیں وہ حقیقی اور جذباتی ہونے کے بجائے زیادہ تر تخیلی اور ذہنی ہے۔ اگرچہ فانی کے کلام پر بھی دوسرے کامیاب شاعروں کی طرح ان کی شخصیت کی چھاپ پڑی ہوئی ہے۔ لیکن یہ خصوصیت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ فانی کی شخصیت، ماحول اور حادثات زمانہ کے ہاتھوں تشکیل پانے کے بجائے زیادہ تر خود انھیں کی ساختہ پرداختہ ہے۔ فانی اپنے کلام ہی کے نہیں بلکہ بڑی حد تک اپنی شخصیت کے بھی خالق ہیں۔ یہ بات سننے والوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہوگی، لیکن فانی کی زندگی کے تفصیلی حالات کی چھان بین کے بعد جس کا فانی کے وطن میں رہ کر حسن اتفاق سے مجھے کافی موقع ملا ہے یہ نکتہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ فانی کی شدید غم پرستی اور الم پسندی کے اسباب ان کی زندگی کے واقعات ہی نہیں بلکہ خود ان کی انوکھی افتاد طبیعت میں تلاش کرنے چاہئیں"۔

اسکے بعد انھوں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ تمام حالات بیان کئے ہیں جنکو میں پورا کا پورا یہاں نقل کر دیتا ہوں تاکہ صورت حال کا ایک واضح نقشہ ناظرین کے سامنے آجائے

"فانی ایک خوش حال گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ یہ گھرانا بدایوں میں اپنی امارت اور شرافت نسبی دونوں کے لئے مشہور تھا فانی نے نوجوانی ہی نہیں ڈھلتی ہوئی جوانی تک کی تمام زندگی دولت اور راحت کی چھاؤں میں بسر کی پینتیس برس کی عمر تک صاحب جائداد اور برسر روزگار باپ کا سایہ سر پر رہا جس نے اس زمانہ کے بلند ترین معیار کے مطابق مسلمانوں کی بے مشہور دارالعلوم علیگڈھ کالج میں رکھ کر انھیں اعلیٰ ترین تعلیم دلوائی۔ کہا جاتا ہے کہ فانی اپنے شہر کے تیسرے مسلم نوجوان تھے جس نے بی اے کی ڈگری حاصل کی پھر والد کے انتقال پر ایک عالی شان محل نما مکان کے علاوہ ۵-۶ سو روپیہ ماہوار آمدنی کی

جائداد ہاتھ آئی - یہ اس ٹھوس سرمایہ کے علاوہ تھی جو وکالت کی سند کی شکل میں پہلے سے ان کے پاس موجود تھا - لیکن معلوم ہوتا تھا کہ جیسے فانی کو یہ فراغت کاٹے کھاتی ہو - تھوڑے ہی دنوں میں ناقابل اسراف کی بدولت اپنی آبائی جائداد کے ولے نیارے کر دئے - وطن سے طبیعت بیزار ہوگئی تو وکالت کے سلسلہ میں اٹاوہ، آگرہ، لکھنؤ اور خدا جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی لیکن عالم یہ تھا کہ اُن کی بیقرار طبیعت انھیں کہیں زیادہ دنوں جم کر بیٹھنے نہ دیتی - یہ نہ سمجھئے گا کہ وکالت کی سرد بازاری انھیں ایک شہر چھوڑ کر دوسرے شہر کے لئے رختِ سفر باندھنے پر مجبور کرتی تھی - جی نہیں - واقعات شاہد ہیں کہ وہ جہاں جاتے اُن کے کمال کا شہرہ اُن سے پہلے وہاں پہونچ جاتا اور بہت جلد اُن کی شاعری ایسے ہمدردوں کا ایک گروہ پیدا کرلیتی جو اُن کے پیشے کو ہر طرح چمکانے کی سعی بلیغ کرتے - فانی کے ایک ہموطن نے جو اُن کے گہرے دوست رہ چکے ہیں اور جنھیں مدتوں سفر و حضر میں فانی کی ہمنشینی کا فخر حاصل رہ چکا ہے مجھ سے خود بیان کیا کہ وہ جس شہر میں بھی جاکر وکالت شروع کرتے وہاں تھوڑے ہی دنوں میں اپنے کمال شاعری کی بدولت افسروں کے منظورِ نظر بن جاتے اور اُن میں سے بعض وارفتگان ادب کی ہمدردی کا تو یہ عالم تھا کہ اپنی عدالت کے ملزموں کو بہ اصرار فانی کو اپنا وکیل قرار دینے پر آمادہ کرتے - پھر یہ بھی نہ تھا کہ فانی کی ذہانت صرف اُن کی شاعری تک محدود ہو - جن بزرگوں نے فانی کو مقدمات کی پیروی کرتے دیکھا ہے وہ اُن کی حیرت انگیز قانونی ذکاوت اور غیر معمولی سوجھ بوجھ کے آج تک قصیدہ خواں ہیں -

بدایوں کے ایک دوسرے فاضل دوست کا فانی کے متعلق بیان ہے کہ "اُن کے نزدیک گھر سے کچہری تک جانا اتنی بڑی مصیبت تھی کہ محنتانے کی کوئی رقم اس کا بدل نہ ہوسکتی تھی چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ کچہری کے قصد سے دروازے تک آئے، دھوپ کی تمازت دیکھ کر العظمت للہ کہا اور پھر گھر میں واپس چلے گئے - اٹاوہ میں ایک ڈپٹی کلکٹر اُن کے بڑے قدرشناس تھے وہ چاہتے تھے کہ فانی کو احتیاج کی صورت نہ دیکھنی پڑے - چنانچہ ایک اردلی کی مستقل خدمت یہ تھی کہ فانی کو گھر سے کچہری تک پہونچا دے - آگرہ میں ایک سب جج فانی کے بڑے مداح تھے یہاں تک کہ وہ ہر مشاعرے میں جہاں فانی کو بلایا جانا شرکت کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے - اُن کا معمول تھا کہ ہر کمیشن فانی کے سپرد کر دیتے - بیان کیا جاتا ہے کہ ایک ایک ماہ میں چودہ چودہ سو کے کمیشن فانی کو دئے گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم پیشہ وکلا نے افسران بالا کو شکایتیں لکھنا شروع کر دیں لیکن نہ حکام کی نوازشیں فانی کے افلاس کا علاج کرسکیں نہ احباب کی فہمائشیں"

فانی کے والد کا انتقال ۱۹۱۷ء میں ہوا - اسوقت فانی کی عمر لگ بھگ ۳۷ سال کی تھی - ۳۷ سال کی اس طویل مدت میں فانی کو جو کچھ بننا یا بگڑنا تھا وہ بن یا بگڑ چکے تھے اور اُن کی طبیعت اور اُنکا شعور پختگی کے تمام منازل طے کر چکا تھا - ظاہر ہے کہ ان حالات میں جو اوپر بیان کئے گئے غم روزگار کا سوال ہی سرے سے پیدا نہیں ہوتا تھا - رہا غم جاناں سو داخلی اور خارجی شواہد سے صرف ایک آدھ اوچھی سی چوٹ کا پتہ چلتا ہے، محض ایک خراش جو شاعر کی زندگی پر رعنائی اور رنگینی کا ہلکا سا پرتو تو ضرور ڈال سکتی ہے لیکن دل کا خون نہیں کرسکتی"

یہ خود فانی کے ایک ہم وطن شخص کا بیان ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس کو غلط سمجھا جائے۔ پھر یہ شدید قسم کا غم فانی کی شاعری میں کہاں سے آیا؟ اس کا جواب صاحب مضمون نے یہ دیا ہے کہ وہ اپنی سادہ اور پُرسکون زندگی سے بیزار تھے اور ان کی بے چین طبیعت ایک گہرے، پائدار داغ غم کی آرزومند تھی۔ باہر کی دنیا سے جب وہ حسب دلخواہ غم کی جراحتیں حاصل کرنے میں ناکام رہے تو اپنے ہی ناخن سے اپنے سینہ کو زخمی کرکے لہولہان بنایا۔ اس تشریح کے بعد وہ لکھتے ہیں:

"سچ پوچھئے تو فانی کی اس نوع کی غم پرستی دراصل لذتیت کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے یہ لذتیت مثبت نہیں منفی قسم کی ہے اور ماہرین نفسیات اس نکتہ سے خوب واقف ہیں کہ جب نفس انسانی اس قسم کی معکوس لذتیت میں مبتلا ہوجاتا ہے تو پھر اس کی ساری دنیا سمٹ کر لذت کے ایک چھوٹے سے نقطہ میں محدود ہوجاتی ہے"۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

"فانی خود اپنے غم کی تصویر میں اتنا مگن رہتے ہیں کہ انھوں نے کبھی نگاہ اُٹھاکر کائنات کے غم پر نظر نہ ڈالی۔ اسلئے فانی کا غم محدود اور ذاتی ہے اور سماجی حیثیت سے بھی اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں"۔

ذوقی صاحب (مضمون نگار) نے فانی کے حالات معلوم کرنے میں تو بڑی کاوش کی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ان معلومات کی بنیاد پر فیصلہ کرتے وقت انھوں نے کچھ زیادہ غور و فکر سے کام نہیں لیا اور عام خیال کے ماتحت ایک نتیجہ پر پہونچ گئے ہیں۔ آج حالت یہ ہے کہ زندگی اور اس کی کامیابیوں کا تصور تمام تر صرف دنیا کے موجودہ نظام سے وابستہ ہوکر رہ گیا ہے۔ جد و جہد کی جو شکلیں رائج ہیں اور جو نظرئے عام طور پر دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بس وہی اصل اور حقیقت سمجھ لئے گئے ہیں۔ اگر کوئی اس کی پیروی کرتا ہے تو کرے ورنہ آجکل کی اصطلاح میں وہ خیالی اور رجعت پسند وغیرہ کے نام سے پکارا جائے گا۔ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے یہ فیصلہ بھی۔ آپ نے دیکھا کہ فانی سماج وغیرہ کی کچھ باتیں نہیں کرتے نہ آزادی اور جمہوریت کا نام لیتے ہیں جو آج کل کے زمانہ میں سب سے زیادہ اہم ہیں۔ تو اب اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی تھی کہ وہ ایک موہوم چیز کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور محض اپنی انوکھی افتاد طبیعت کا شکار ہیں۔ کیونکہ جو باتیں آپ کے دماغ میں سمائی ہوتی ہیں۔ آپ کے نزدیک دنیا میں اس کے علاوہ اور ہے کیا جو کسی کے دماغ میں جگہ پائے۔

فانی کے اوپر معکوس لذتیت میں مبتلا ہونے کا الزام تو خود صاحب مضمون ہی کے ارشادات کے مطابق صحیح نہیں ہے۔ اس قسم کی اُلٹی لذتیت — اگر اس کا کوئی وجود ہو — صرف اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب لذت کے واقعی اسباب بالکل ختم ہوچکے ہوں اور حصول آرزو کی انتہائی کوشش کے بعد آدمی اس کی طرف سے مایوس ہوجائے۔ اور ذوقی صاحب کے سارے مضمون کی بنیاد ہی اسی چیز پر قایم ہے کہ فانی کے یہاں سرے سے اس کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

پھر یہ غم فانی کی شاعری میں کہاں سے آیا، اس کے اسباب ہم کو انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں تلاش کرنا ہوں گے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ محض فانی پر ختم نہیں بلکہ دنیا کی دنیا اس غم میں مبتلا ہوکر رہ گئی ہے پورا عالم انسانی اس وقت ایک

عجیب قسم کی بے چینی میں گرفتار ہے۔ اس کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے کوئی بچہ بھوک پیاس کی حالت میں اپنی ماں سے دور پڑا ہوا ہو۔ وہ ہاتھ پاؤں ٹپک رہا ہو اور پریشان ہو کبھی انگوٹھا چوستا ہو۔ کبھی ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے میں کوئی پاس کی چیز ملے تو اس کو اُٹھا کر مونھ میں ڈال لیتا ہو، اس کو بڑی شدت سے ایک چیز کی تلاش ہو جو اس کے درد کا علاج کر سکے گی۔ وہ چیز جو اس کی ہستی کے ایک ایک گوشہ میں سمائی ہوئی ہے اور اس کی شخصیت سے بہت قریب ہے اتنی قریب کہ اس سے زیادہ قریب کوئی چیز نہیں ہو سکتی مگر وہ بالکل نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے۔ وہ صرف اندرونی طور پر اپنے دل کی گہرائیوں میں ایک چیز کی تڑپ محسوس کرتا ہے مگر سامنے کی دنیا میں کوئی چیز نہیں ملتی جو اس کی تسلی کر سکے۔ وہ ایک چیز پاکر سمجھتا ہے کہ شاید یہی ہے جس کو میں تلاش کر رہا ہوں مگر جب مونھ میں ڈالتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے دل کی پیاس نہیں بجھتی۔

یہ ایک مستقل صورت حال ہے جو آج لوگوں کے اوپر مسلط ہو کر رہ گئی ہے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا کیا علاج کرے۔ کسی نے دوسری چیزوں کے خیال میں محو ہو کر غم غلط کرنے کی کوشش کی ہے اور کوئی اسی درد دل میں بے چین ہو کر رہ گیا ہے۔ اس طرح جو لوگ ہنستے ہیں وہ بھی اور جو روتے ہیں وہ بھی دونوں ایک ہی قسم کی صورت حال سے دوچار ہیں دونوں کو اصل مقصود کا سراغ نہیں ملا ہے اور اس ناکامی کو کسی نے ہنس کر گزارنے پر قناعت کر لی ہے اور کوئی رو دھو کر تسکین کرنا چاہتا ہے اور اس لحاظ سے دیکھئے تو اصغر کا "جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا" اور فانی کا "تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو" دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟ یہ مشکل جو پیش آرہی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ اس کا جواب مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا کا نظام اپنی اصل ہیئت سے بگڑ کر غلط اور خلاف واقعہ بنیادوں پر قایم ہو گیا ہے کائنات کے اندر ایک بنیادی حقیقت ہے جو اپنے زبردست کنٹرول کے ذریعہ اس عظیم الشان کارخانہ کا نظام قایم کئے ہوئے ہے۔ یہ حقیقت بالکل اٹل ہے اور بجائے خود محکم حیثیت رکھتی ہے۔ ایٹم کے خوردبینی ذروں سے لے کر بڑے بڑے سیاروں تک سب اس کی بندش میں جکڑے ہوئے ہیں اور یہی بندش ان کو اپنی اصل جگہ پر قایم رکھ کر انھیں مفید طریقہ سے اپنا فرض منصبی انجام دینے کے قابل بناتی ہے یہ بندش ایک لمحہ کے لئے بھی اگر ذرا سی ڈھیلی پڑ جائے تو زمین آسمان آپس میں ٹکرا جائیں اور ساری کائنات چشم زدن میں غارت ہو کر رہ جائے۔

آدمی بھی کائنات کے اسی وسیع اور عظیم الشان کارخانہ کا ایک جزو ہے اور جو قانون سب کے لئے ہے اس کی زندگی بھی اسی کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ مگر آدمی اور دوسری مخلوقات میں یہ فرق ہے کہ دوسری چیزیں بالکلیہ پابند ہیں اور کسی حیثیت سے ایک سکنڈ کے بھی اپنے نظام سے الگ نہیں ہو سکتیں مگر انسان کی اس کے علاوہ ایک ممتاز حیثیت بھی ہے وہ خود اپنی ایک قوت ارادی رکھتا ہے اور بالکل خود مختار ہے کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے مگر یہ خود مختاری صرف رد و قبول

کی حد تک ہے - زندگی میں اصل فیصلہ کن چیز وہی بنیادی قانون ہے جو تمام کائنات کے اندر یکساں طور پر کام کر رہا ہے آدمی یہ تو کر سکتا ہے کہ دیکھنے سے آنکھیں بند کر لے - مگر اس کے بدلے وہ اپنی پیٹھ پر کوئی آنکھ نہیں پیدا کر سکتا - بڑے بڑے مصنوعی شیشوں سے دیکھنے کا کام لے سکتا ہے - یہ قدرت کا اٹل قانون ہے کہ جو چیز جس خاص مقام کے لئے بنی ہے اسی جگہ اس کو باقی رکھ کر کام لیا جائے، ورنہ مفید ہونے کے بجائے انسانیت کے لئے تباہ کن ثابت ہوگی - یہ ہمہ گیر قانون آدمی کی پوری زندگی کے تمام شعبوں پر یکساں طریقہ سے محیط ہے اور صرف اسی کے ذریعہ سے آدمی اپنی رفتار کا وہ صحیح رخ نہیں کر سکتا ہے جو اسے کائنات کا ایک مفید ترین جزو بننے میں کامیاب کرے -

یہی فطرت ہے اور ہر شخص اسی فطرت صحیح پر پیدا ہوتا ہے - یہ کوئی اوپری قسم کی وضع داری نہیں ہے بلکہ خود انسانی سرشت اور اس کی افتاد کے عین مطابق ہے - یہ زندگی کا بالکل سیدھا اور صاف راستہ ہے - اس کے علاوہ جتنے راستے ہیں وہ ایچ پیچ کے راستے ہیں جن کے اوپر آدمی کی شخصیت کبھی سلامت نہیں ہو سکتی، ہماری شخصیت کے اندر فطرت کی بالکل وہی حیثیت ہے جو کسی انجن میں اس کی مشینری کی ہوتی ہے - جس انجن کی جیسی مشینری ہو اسی کے حساب سے اس کو حرکت دینے کی ضرورت ہے ورنہ وہ اپنا صحیح کام انجام نہ دے سکے گی - ہوائی جہاز کی کل اور ریل کا انجن دونوں دو طریقے سے بنے ہیں اور دونوں اپنی موت مفید طریقہ سے چل سکتے ہیں جب ان کو اپنی مخصوص مشینری کے لحاظ سے استعمال کیا جائے ـــــ ٹھیک اسی طرح آدمی بھی جس فطری ساخت پر پیدا ہوا ہے اسی فطری ساخت کے مطابق عمل کر کے وہ اپنے صحیح اور موزوں مقام کو پا سکتا ہے - اسکے علاوہ جتنے راستے اختیار کئے جائیں گے چاہے اس کے ذریعہ سے ہم آسمان کی بلندیوں پر پہونچ جائیں اور قوس قزح کے جلووں میں جا بسیں مگر حقیقی امن اور سچا اطمینان کبھی نصیب نہیں ہو سکتا -

اس وقت آدمی اپنی فطرت ـــــ خود اپنی شخصیت کے مطالبات جس کے مطابق طبعی طور پر آدمی جینا چاہتا ہے ـــــ سے دور ہٹ گیا ہے - اس لئے اس کی زندگی ایسی ہو گئی ہے جیسے گول خانہ میں زبردستی چوکھٹی چیز بٹھانے کی کوشش کی جائے - اگر وہ اپنے عمل کو اپنی فطرت سے ہم آہنگ کر دے، اور وہی کام کرے جس کی قدرتی طور پر اس کے اندر خواہش رکھی گئی ہے تو اس کا وجود اپنی زندگی میں راز ہے جس کی طرف فانی نے اپنے شعر میں اشارہ کیا ہے

پڑتا نہیں اس آئینہ میں عکس کوئی اور ۔۔۔ دل میں تری تصویر سی رکھ دی ہے کسی نے

فطرت کا راستہ نہایت سیدھا اور صاف راستہ ہے - اتنا کہ اس سے زیادہ سیدھا اور صاف راستہ کوئی نہیں - قدرتی طور پر ہر شخص کے اندر اس راستہ کی پہچان اور اس کی کشش موجود ہے - مگر جس دنیا میں آدمی آنکھ کھولتا ہے وہ بگڑتے بگڑتے اب اپنے اصل راستہ سے اتنا دور جا پڑی ہے کہ اس میں فطرت کے سیدھے خط کے ادھر ادھر اتنی مختلف راہیں نکل آئی ہیں کہ اب کسی شخص کے لئے محض اپنی اندرونی قوت تمیز کے اوپر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ وہ ان بے شمار راہوں میں سے کون سی راہ اختیار کرے - ایک طرف اس کے حوصلے اور امنگیں کسی بلند مقام پر پہونچنے کے لئے بے چین ہوتی ہیں، وہ اپنے جذبات کی

رو میں ہر اس چیز کی طرف لپکتا ہے جس کو بظاہر خوش نما اور عالیشان دیکھتا ہے مگر ظاہر ہے کہ دُنیا کی کوئی چیز بس یوں ہی نہیں مل جاتی بلکہ اپنے حصول کے لئے زبردست جد وجہد اور سرفروشی کا مطالبہ کرتی ہے۔ پھر اس طویل جد وجہد کے لئے لازم ہے کہ آدمی جو کام کرے پورے طور پر اس سے ہم آہنگ ہو، یعنے اس کو اچھی طرح اس بات کا یقین ہو کہ جو میں کر رہا ہوں وہی کرنے کا کام ہے اور اسی کو مجھے کرنا چاہیئے۔ یہی اصل بنیاد ہے جس پر کسی شخص کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے کام سے خوب مطمئن ہے اور اس کی تمام ذہنی اور جذباتی کیفیتیں اس کے عملی صورتِ حال سے موافقت کر رہی ہیں تو وہ اپنی جد وجہد کی راہ میں ہر آنے والی مشکل کا نہایت خندہ پیشانی سے مقابلہ کرے گا اور انتہائی مستقل مزاجی کے ساتھ اپنا راستہ ہموار کر کے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ کامیابی اس کے قدم لے گی اور وہ اسے اپنا سب کچھ سمجھ کر قبول کر لے گا۔ اس کے برعکس جو شخص اپنے کام پر مطمئن نہیں ہے۔ یعنے اس کو یقین نہیں حاصل ہے کہ جو کام وہ کر رہا ہے وہی دراصل کرنے کا کام ہے اور اسی میں اس کی فلاح ہے تو وہ کبھی کامیابی تک نہیں پہونچ سکتا۔ اس کی یہ بے یقینی قدم قدم پر اس کو متزلزل کرتی رہے گی۔ کبھی وہ دشواریوں کا پہاڑ دیکھ کر ہمت ہار جائے گا کبھی دوسرے کسی کام کی ظاہر فریبی اسے اپنی طرف کھینچنا چاہے گی اور وہ یہ سمجھ کر چلا جائے گا کہ شاید اسی کے اندر مجھے سکون و اطمینان کی نعمت مل جائے۔ غرض اسی گھبراہٹ میں وہ ہر طرف دوڑتا پھرے گا اور آخر کار کسی طرف کا نہیں ہوگا۔

یہ کیفیت کسی شخص کی کیوں ہوتی ہے۔ وہ کیوں دنیا کے عام کاروبار میں اپنے کو جذب نہیں کر سکتا یہ حقیقت میں فطرت صحیح کا رجحان ہے جو غیر محسوس طور پر دنیا کے تمام بگڑے ہوئے کاروبار کو غلط سمجھتا ہے اور اپنے تصور کے مطابق کسی کو مناسب نہ پا کر سب کے ساتھ ابا کرتا رہتا ہے۔ ایک طرف آدمی کے دل میں اس کی فطرت کی چھپی ہوتی ہے لگن ہوتی ہے جس کے متعلق وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ وہ ایک نامعلوم جذبہ ہے کیونکہ سامنے کی دنیا میں کوئی محسوس ذریعہ نہیں ہے جو دل کی اس کیفیت کو شعوری طور پر سمجھنے میں مدد دے۔ دوسری طرف دنیا جو کہتی ہے کہ میری طرف آتے ہو تو پورے طور پر میرے ہو کر آؤ اور اپنے دل کی ادنیٰ سی خلش بھی باقی نہ رہنے دو۔ اس کشاکش میں کبھی دنیا کھینچتی ہے کبھی دل اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی طرف کا نہیں رہتا۔ مگر جو لوگ ذرا سوجھ بوجھ والے ہیں اور جن میں آگا پیچھا سوچنے کی صلاحیت ہے وہ عام طور پر اس مرحلہ سے بڑی آسانی سے پار اُتر جاتے ہیں۔ یہ لوگ دنیا میں کاروبار کے جتنے طریقے پھیلے ہوتے ہیں انھیں یہ کہہ کر قبول کر لیتے ہیں کہ چونکہ اسی میں عزت اور آرام ہے اس لئے دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ قلق کے موہوم جذبہ کو دبا کر سامنے کی اس حقیقت کو قبول کر لیا جائے زندگی کا یہی تاریک موڑ ہے جس کے متعلق فانی نے کہا ہے:

ممکن نہیں ہے راحتِ دنیا کی آرزو　　غم پر گمان راحتِ دنیا کئے بغیر

اس کے برعکس جو لوگ جذباتی قسم کے ہوتے ہیں اور حال اور مستقبل کی زیادہ فکر نہیں کرتے وہ عام طور پر اس کو قبول نہیں کر سکتے یا کرتے بھی ہیں تو اس طرح کہ ہمیشہ ان کی اپنے اندرونی جذبات سے لڑائی رہتی ہے۔ فانی اسی دوسری قسم کے لوگوں

میں تھے - اس قسم کے لوگ ایک طرف تو اپنی خیالی فضا میں بہت دور دور تک پرواز کرتے ہیں - مگر نہ تو ان بلندیوں کا ان کے دماغ میں کوئی متعین تصور ہوتا ہے جہاں پہونچنے کی باقاعدہ طور پر کوشش کر سکیں نہ وہ دنیا کے مطالبات ہی پورا کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں کہ دنیا میں عزت اور کامیابی کی جو صورتیں ہیں وہی ان کو حاصل ہو جائیں - اس طرح وہ کسی مدمیں نہیں رہتے - دنیا سے اگر کسی طریقہ سے انھیں کچھ مل بھی جاتا ہے تو عام طور پر اس سے وہ مطمئن نہیں ہو سکتے کیونکہ جس جذبہ پر ان کے حوصلوں اور تمناؤں کی بنیاد ہوتی ہے وہ دنیا کی مروجہ قدروں سے بالکل مختلف ہوتا ہے - مگر سامنے کی دنیا میں چونکہ خوبی اور سربلندی کے وہی معیار ہیں جو کہ ہیں اس لئے ماحول کے تاثر سے اپنے خوابوں کی تعبیر کیلئے غلطی سے وہ انھیں کو اپنا مرکز بنا لیتے ہیں مگر جب قریب سے معاملہ پڑتا ہے تو ان کو اپنے درد کا علاج نہ پاکر بیزار ہو جاتے ہیں اور چھوڑ بیٹھتے ہیں - ان کی یہ کیفیت محض بے عملی یا آجکل کی اصطلاح میں زندگی کی حقیقتوں سے گریز کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ خود زندگی کی مروجہ شکلوں کے نادرست ہونے کا احساس ان کی فطرت سلیم کو اس کی طرف سے بد دل کر دیتا ہے اور وہ اپنے فطری تقاضوں کے موافق نہ پاکر اس سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے -

کچھ شرح بے خودی ہے کچھ ہوش کا فسانہ　　یہ بے حسی جو شاید تنقید زندگی ہے

مگر چونکہ اپنے تصور کا کوئی واضح نقشہ ان کے سامنے نہیں ہوتا اس لئے وہ صرف مضطرب اور ڈانواڈول ہو کر رہ جاتے ہیں، جو ہے اس کو قبول نہیں کر سکتے اور جو نہیں ہے اس کا کوئی اصولی خاکہ ان کے دماغ میں نہیں ہوتا جس کے مطابق ایک قیام کی جد و جہد کر سکیں - یہی لوگ اگر فطری اصولوں کے مطابق ایک مقصد کی راہ پر انھیں ڈال دیا جائے تو پامردی اور ایثار کے نہایت بلند کارنامے دکھا سکتے ہیں، اسی فداکاری کے لئے تو وہ پریشان ہیں، مگر، کوئی راہ نہیں ملتی اس لئے مجبور ہو کر رہ گئے ہیں -

جبینِ درد ہے بے تاب سجدہ اے فانی　　کدھر ہے خاک ترے دل کے آستانے کی

ان کی مشکل ان کی کمزوریوں کی نہیں بلکہ ان کی خوبیوں کی پیدا وار ہے - ان کو اپنی جس بے تعلقی کی وجہ سے دنیا کی جائداد مسرت میں سے کوئی حصہ نہیں ملا وہ ان کی بے غرضی نہیں تھی بلکہ فطرت کا وہ احساس جو دنیا کے کاروبار کو غلط سمجھتا ہے اور کسی حال میں اس سے موافقت نہیں کر سکتا -

احساس محبت ہی مری موت ہے فانی　　اس زندگی نے مجھے جان سے مارا

یہ جو کچھ میں نے عرض کیا - یہ محض تمثیل یا قیاس آرائی نہیں بلکہ مستقل حقیقت ہے جس کو ہر شخص اپنے اندر ٹٹول کر دیکھ سکتا ہے - ذہنی افلاس یا اسباب زندگی کی فراوانی نے بدقسمتی سے یہ سوچنے کا موقع ہی نہ دیا ہو کہ زندگی کیا ہے اور اسے کیا کرنا چاہئے - بلکہ انھیں پیدا ہوتے ہی ایک بنا بنایا چکر ملا جس میں وہ کولھو کے بیل کی طرح لگا دئے گئے اور آنکھوں پر پٹی بندھی ہونے کی وجہ سے انھیں کچھ زیادہ دیکھ بھال کی فرصت بھی نہ ملی - ان کا تو ذکر ہی کیا - مگر جو لوگ زندگی کی پیچیدگیوں

پڑے ہیں اور جنہیں دنیا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ اس چیز کو خوب جانتے ہیں اور یقیناً وہ میری تصدیق کرنے پر مجبور ہوں گے۔

یہاں تک نفس مسئلہ پر محض واقعاتی حیثیت سے تبصرہ تھا۔ اب میں خود فانی کے کلام سے ثابت کرکے بتاؤں گا کہ فانی کا غم نہ تو زندگی کا غم تھا اور نہ وہ محض شعر کی کھیتی سرسبز کرنے کے لئے خون دل کی فراہمی تھی بلکہ وہ اصل میں حقیقت کا غم تھا۔ فانی کے دل میں فطری طور پر جو ایک بلند انسانیت کا تصور تھا اس کی تلاش میں وہ بے چین تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح اسے حاصل کرلیں مگر خود ان کے ذہن میں اپنے جذبہ کا کوئی متعین تصور تھا نہ یہی معلوم تھا کہ وہ چیز جس کی انھیں سب سے زیادہ تلاش ہے کہاں مل سکتی ہے۔ ان کی یہ تلاش، جیسا کہ میں نے ابھی تفصیل سے بیان کیا۔ محض ایک طرح کی انفرادیت نہیں بلکہ اسی عالمگیر شورش کا ایک کرشمہ تھی جو دنیا کا نظام ابتر ہوجانے کی وجہ سے ہر معقول شخص کو حقیقت کی تلاش میں پیش آرہی ہے۔

ہر دل ہے تیرے غم کی امانت لئے ہوئے ذرے ہیں اک جہانِ حقیقت لئے ہوئے

فانی کے کلام کا مطالعہ کرنے سے دو باتیں بہت صاف طور پر محسوس ہوتی ہیں، ایک یہ کہ ان کا غم حقیقت میں ایک چیز کی تلاش میں سرگردانی اور اس کے نہ ملنے کی پریشانی ہے وہ یوں ہی نہیں روتے۔ نہ کسی کھوئی ہوئی چیز کا غم انھیں ستاتا ہے بلکہ خود اپنی زندگی کا راز ان کی سمجھ میں نہیں آتا اور اسی کے جاننے کے لئے ان کی شخصیت بے چین ہے، وہ جب کہتے ہیں کہ:

دنیا میں دیا دل فانی کے سوا اور وہ کون سی بستی ہے جو آباد نہیں ہے

یا کون ہے میرے سوا فیض چمن سے محروم گل بداماں ہے کوئی خار بداماں کوئی

تو درحقیقت اس کے پیچھے یہ احساس چھپا ہوتا ہے کہ ان کا غم دنیا سے نرالا ہے۔ لوگ جس چیز کو پاکر مطمئن ہوگئے ہیں، فانی کے لئے اس میں کوئی کشش نہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

عشق جہاں باعث نشاط نہیں ہے خندۂ تصویر انبساط نہیں ہے

وہ چیزوں کی محض ظاہری کیفیت پر خوش نہیں ہوجاتے، بلکہ اسکی گہرائیوں میں پہونچنا چاہتے ہیں ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہئے مگر موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

یہ تو معلوم نہیں کیا ہے یہ دنیا لیکن صرف صد رقص ہے صورت کدۂ جاں کوئی

اس قسم کے اشعار فانی کے دیوان میں بھرے ہوئے ہیں جو بتاتے ہیں کہ شاعر اصل میں زندگی کی حقیقت جاننے کے لئے بے چین ہے چنانچہ دوسری جگہ کہتے ہیں کہ اگر صرف دنیا کا غم ہوتا تو کسی طریقہ سے ہم اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے مگر یہاں تو ایک اور ہی

چیز کا غم ہے جو دنیا کے موجودہ نقشہ میں کہیں نظر نہیں آتا۔

یہ درد لاعلاج محبت دوا بھی ہے — تھا ورنہ کچھ علاج غمِ روزگار کا

پھر کہتے ہیں کہ اگر دُنیا ہی ہمارے پیشِ نظر ہوتی تو ناکامی کی صورت میں دنیا سے گزر کر ہم اس درد سے نجات حاصل کر سکتے تھے مگر ایسا بھی نہیں ہے کیونکہ یہاں خود زندگی کی تلاش ہے اور وہ مرجانے سے حاصل نہیں ہوتی۔

یہ درد محبت غم دنیا تو نہیں ہے — اب موت بھی جینے کا سہارا نہ رہے گی

دوسری بات جو فانی کے یہاں ملتی ہے وہ یہ کہ یہ حقیقت کا غم خود اپنی فطرت کی تلاش ہے جس چیز کو وہ ڈھونڈ رہے ہیں وہ کوئی باہر کی موہوم چیز نہیں بلکہ خود اپنے دل کی آواز اور اندر ہی کی ایک تڑپ ہے جس کو وہ محسوس طور پر اپنی زندگی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ چیز کہیں نظر نہیں آتی۔

ہم ہیں اس کے خیال کی تصویر — جس کی تصویر ہے خیال اپنا

وہ دل کی آڑ میں رہتے ہیں فانی — تمنا میرے ان کے درمیاں ہے

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی — وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

میری فطرت ہے گوش برآواز — سن رہا ہوں نوائے محرم کیا؟

یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں — آواز آ رہی ہے بہ کب کی سنی ہوئی

یہ اشعار صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ شاعر ایک جانی بوجھی حقیقت کی جستجو میں بے چین ہے اس نے تخیل کے دھندلکے میں محض جذباتی طور پر کوئی نقطہ پیدا نہیں کیا ہے بلکہ اسی کی سرشت میں ایک چیز کی طلب، اول روز سے موجود ہے اور اسی کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔

یہ طلب محض ایک اتفاقی کیفیت یا آدمی کی عام شخصیت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ یہی عین شخصیت ہے۔ آدمی کی اپنی جو فطری ساخت ہے اس کا طبعی تقاضا ہے کہ اس کی زندگی کا دُنیا میں جو مصرف ہو اور جس قسم کے کاروبار میں اسے رکھا جائے وہ بالکل اس کے مناسب حال ہو۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے کوئی انجن اسی وقت اپنا کام انجام دے گا جب اس کی مخصوص مشنری کے لحاظ سے اسے حرکت دیجائے۔ یہ کائنات زمین و آسمان کی تمام پہنائیوں کے ساتھ ایک سلطنت ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس بڑی سلطنت کے تمام شعبے نہایت کمال اور باقاعدگی کے ساتھ اپنا کام کر رہے ہیں۔ صرف حضرت انسان کا یہ حال ہے کہ ان کے یہاں ایک عالمگیر شورش اور فساد برپا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کائنات کی اور تمام چیزیں اپنی فطرت کے صحیح مرکز پر قایم ہیں اور انسان اس سے منحرف ہو گیا ہے، ریل جب تک اپنی پٹری پر ہے زیادہ سے زیادہ تیز دوڑ سکتی ہے، لیکن اپنا راستہ چھوڑ کر اگر وہ کسی اور طرف جانے لگے تو پھر وہ ایک قدم بھی سلامتی کے ساتھ نہ بڑھ سکے گی اور اس کی تیز رفتاری کی تمام قوتیں خود اسی کے مہلک ثابت ہوں گی۔

فانی کی مشکل اسی قسم کی ہے۔ وہ اپنی فطرت کے تقاضوں سے بے چین ہیں اور ہر چیز جو بظاہر دل فریب شکل میں سامنے آتی ہے اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں مگر قریب سے دیکھنے کے بعد وہ محض سراب ثابت ہوتی ہے۔

شوق بے تاب کا انجام تحیر پایا　　دل سمجھتے تھے جسے دیدۂ حیراں نکلا

اس طرح کا قصہ بار بار پیش آیا ہے اس لئے اب کسی نئی امید کا پیدا ہونا ان کے لئے ایک مزید غم کی تمہید ہو کر رہ گیا ہے۔

پھر ملی غیب سے نوید نشاط،　　غم کے ساماں ہوئے فراہم کیا

مگر بار بار کے ناکام تجربوں کے بعد بھی دل کی لگن ختم نہیں ہوتی اور کہیں نہ کہیں سے امید کا کوئی نیا گوشہ نکال لیتی ہے۔ اس طرح ہر روز نئی نئی امیدوں کی جھلک اس کا بھی موقع نہیں دیتی کہ مایوس ہو کر موت کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کریں۔

ہر لمحۂ حیات رہا وقف کار شوق،　　مرنے کی عمر بھر مجھے فرصت نہیں رہی

یہاں تک کہ جب حقیقت کا کہیں سراغ نہیں ملتا تو سمجھتے ہیں کہ شاید یہ میری تلاش محض فریب خیال ہے جسکی کوئی اصل نہیں۔

تجلیات وہم ہیں مشاہدات آب و گل　　کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

اس شعر میں 'تجلیات' سے مراد عالم تصور کے جلوے (آئیڈیل) ہیں جنھیں حاصل کرنے کے لئے شاعر بے چین ہے 'مشاہدات' سے مراد دنیا کے پھیلے ہوئے کاروبار ہیں جن میں وہ اپنا گوہر مقصود ڈھونڈ رہا ہے۔ اور کرشمۂ حیات سے مراد زندگی کی وہ تڑپ ہے جو دل کے اندر چھپی ہوئی ہے۔

اسی تلاشِ حقیقت میں فانی تمام عمر حیران و پریشان رہے۔ اسی سلسلہ میں جو جو مرحلے انھیں پیش آتے ہیں وہ پوری تفصیل کے ساتھ ان کے کلام میں ہم کو نظر آتے ہیں، بلکہ ان کی شاعری تمام تر اسی کی روداد ہے۔ اور اگر ان کا کلام ردیف وار کے غیر فطری طریقہ کے بجائے تاریخی ترتیب سے چھپا ہوتا تو ہم پوری تفصیل کے ساتھ بتا سکتے تھے کہ ان کے خیالات نے کس طرح اور کیا کیا کروٹیں لی ہیں اور اپنی تلاش و جستجو میں وہ کہاں کہاں پہونچے ہیں مگر افسوس کہ ان کے ردیف وار کلیات میں اسکا امکان نہیں ہے اس لئے مجبوراً ہم بغیر کسی خاص ترتیب کے مختصر طور پر چند اشعار پیش کر دیتے ہیں جس سے مختلف مراحل کا ایک سرسری نقشہ ناظرین کے سامنے آجائے گا۔

کسی نے تجھ کو نہ جانا مگر یہ کم جانا　　یہ راز ہے کہ کوئی راز داں نہیں ملتا

جلوۂ کثرت نمود اپنا شوق بے اندازہ تھا　　محملِ لیلیٰ مری نظروں میں لیلیٰ ہو گیا

اب نئے سر سے چھیڑ پردۂ ساز　　میں ہی تھا ایک دکھ بھری آواز

دل کی جو لگن فانی کو سب سے زیادہ عزیز تھی جب اس کی واقعی تصویر کہیں نہیں ملی، تو سمجھتے ہیں کہ شاید یہ میری آشفتگی ہے جس کا حقیقت کی دنیا میں کوئی وجود نہیں مگر چونکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے اس لئے ایسا سمجھنے کے بعد بھی اپنی فطرت کو بدل نہیں سکتے۔ اس لئے انفرادیت کے گوشہ میں سمٹ آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ کر گزر جاؤ۔

ماورائے حدِ ہر منزل ہے شاید کوئے دوست　　ہم نے جو چھانی نہ ہو ایسی کوئی منزل نہیں

حسرت ان حرماں نصیبوں پر جو ہوش آنے کے بعد　　خواب آغوشِ قفس میں آشیاں دیکھا کئے

تجربہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس چیز کی تلاش میں ہیں وہ کہیں نہیں ملتی۔ اس لئے سوچتے ہیں کہ دنیا میں دوسری جو ملنے والی چیزیں ان کی طرف توجہ کرنا چاہئے مگر دل کا جذبہ اب بھی اسی کی راہ دیکھے جا رہا ہے۔

اسرار زندگی کو سمجھوں تو کیا میں سمجھوں　　جس زندگی کو دیکھا تردید زندگی ہے

یعنے جذبات جس کو بظاہر اچھا دیکھ کر پسند کرتے ہیں۔ قریب سے دیکھنے کے بعد فطرت کا رجحان اسے رد کر دیتا ہے۔

فانی اس انقلاب سے وحشت عشق کی پناہ　　آہ وہ بزم دل جو آج انجمن حواس ہے

بار بار کی ناکامی سے تنگ آکر سمجھتے ہیں کہ شاید یہ میرے مزاج کی بے آہنگی ہے اور کچھ نہیں اس لئے دل کے پیچھے دوڑنے کے بجائے ذرا "سمجھ بوجھ" سے کام لینے لگے ہیں۔

اور ہے درد محبت کا نرالا انداز　　روز دل میں تری تصویر بدل جاتی ہے

ہر راہ سے گزر کر دل کی طرف چلا ہوں،　　کیا ہو جو ان کے گھر کی یہ راہ بھی نہ نکلے

معلوم راستوں کا تجربہ کرنے کے بعد دل کی تڑپ کو رہبر بنا کر اسی کے نقش قدم پر چلنا چاہتے ہیں۔

ہزار ڈھونڈیے اس کا نشاں نہیں ملتا　　جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا،

جبیں سے مراد تلاش کا جذبہ ہے اور آستاں سے مراد وہ گوہر مقصود جس کی تلاش ہے۔

خبر قافلۂ گم شدہ کس سے پوچھوں　　اک بگولا بھی نہ خاک رہ منزل سے اٹھا

جو تجھے سمجھا اسے دنیا سمجھ سکتی نہیں　　راز تھا جو راز کا محرم نظر آیا مجھے

کسی کے جلوۂ طاقت ربا کو کیا دیکھوں　　شکست رنگ رخِ کائنات نے مارا

مطلب یہ ہے کہ دنیا کے جلوؤں میں نگاہ اُلجھ کر رہ جاتی ہے اور حقیقت تک نہیں پہونچتی۔

غم ہستی ہی سہی تیرے سوا کوئی ہو　　دل کہ بستی ہے تری غیر سے آباد نہ کر

گزشتہ صفحات میں جو تشریح بیان کی گئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فانی در اصل زندگی کی حقیقت جاننا چاہتے تھے اور اسی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ مگر فانی اپنی تلاش کی جس منزل میں تھے وہ حقیقت میں آشفتگی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان کے اندر ابھی وہ فکر بیدار نہ ہو سکی تھی جو واضح اور متعین اُصولوں کی روشنی میں چیزوں کو اصل حقیقت کے اعتبار سے دیکھے اور محض ان کی ظاہر فریبی میں پھنس کر نہ رہ جائے۔ یہی سب سے بڑی کمزوری تھی جس کی وجہ سے وہ ہر طرف لو لگاتے پھرے اور سب جگہ سے مایوس ہوئے۔ وہ حق کی تلاش میں تھے اور حق کے حصول کی پہلی منزل یہ ہے کہ آدمی کے ذہن سے مرعوبیت اور ہوائے نفس دور ہو جائے وہ محض اوپر کے نقش و نگار میں وقتی دل کشی دیکھ کر مطمئن

ہو جانے کے بجائے اصولی طور پر اصل ماہیت کے اعتبار سے رائے قایم کرنے کا دماغ پیدا کرے اگر اس نے ایسا نہ کیا تو زمانہ کے کاروبار میں ہر طرف اُلجھا رہے گا اور اپنی فطرت کے مدعا کو پانے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔

فانی کی زندگی تمام تر اسی قسم کی فریب خوردگی کی داستان ہے۔ مگر ان کے کلام کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بار بار کے تجربوں کے بعد وہ اس پردہ کی حقیقت سمجھ لینے میں کامیاب ہو گئے تھے ۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ان کا یہ شعر بہت قابل قدر ہے :

فریب جلوہ اور کتنا مکمل - اے معاذ اللہ بڑی مشکل سے دل کو بزم عالم سے اُٹھا پایا

مگر جیسا کہ یہ شعر ظاہر کر رہا ہے ـــــ وہ فریب کے پردہ کو اُٹھا دینے کا کام نہیں کر سکے بلکہ خود اپنی آنکھیں اسکی طرف سے بند کر لیں۔ مگر کسی غلطی میں مبتلا ہونا جتنا بُرا ہے۔ اس کی غلطیوں سے واقف ہو کر دامن بچا جانا بھی اسی قدر برا ہے۔ ایک جہالت ہے تو دوسری بزدلی۔ اصل چیز یہ ہے کہ آپ بہادری سے کام لے کر اس کی غلطیوں کو صحت سے بدل دیں اور اس طرح نہ خود اپنے لئے فضا کو ہموار کریں بلکہ دوسروں کو بھی انسانیت کے ساتھ کامیاب زندگی بسر کرنے موقع دیں۔

وحیدالدین خاں

دی مغل لائن لمیٹیڈ

(سب سے پُرانی ہندوستانی جہازراں کمپنی)

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ بمبئی سے:

عدن، پورٹ سوڈان، جدّہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے

خاص حج سروس

جو حضرات حج کی سعادت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ مندرجۂ ذیل پتہ پر اپنی درخواستیں جلد بھیجدیں۔ لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ جہاز میں جگہ ملنے کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی:۔

ٹرنر مارلیسن اینڈ کمپنی لمیٹیڈ

۱۶ - بنک اسٹریٹ - بمبئی

فلسطین کے مسئلہ میں روس و امریکہ کی ریشہ دوانیاں

مسئلۂ فلسطین کی اہمیت

اس سے انکار ممکن نہیں کہ فلسطین کا مسئلہ صرف فلسطین کا نہیں، بلکہ تمام عرب حکومتوں کا مسئلہ ہے، مغربی یوروپ کی زیست و حیات، امریکہ کے مستقبل اور دنیا کے امن و سکون کا مسئلہ ہے، اور آج نہیں تو کل اس کو بین الاقوامی شکل اختیار کر لینا ہے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے جس وقت تقسیم فلسطین کا فیصلہ کیا تھا تو وہ یہ سمجھتی تھی کہ عربوں کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوگی اور اسی لئے اس نے حفاظتی کونسل سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ اگر تقسیم کے نفاذ میں فوج کے استعمال کی ضرورت ہو تو اس کا بھی معقول انتظام کیا جائے۔

اس لئے اب سوال یہ ہے کہ آیا جنرل اسمبلی کے اس فیصلہ کا نفاذ ممکن ہے یا نہیں اور اگر ہوا تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا — یہود کہتے ہیں کہ اس کا نفاذ ممکن ہے اور گو اس طرح کچھ دنوں کے لئے خانہ جنگی تو ضرور پیدا ہو جائے گی، لیکن عربوں کی مخالفت زیادہ عرصہ تک قایم نہ رہے گی اور پھر امن و سکون ہو جائے گا۔ برخلاف اس کے عرب کہتے ہیں کہ تقسیم فلسطین ناقابل عمل ہے اور ہم یہود حکومت کبھی نہ قایم ہونے دیں گے یہاں تک کہ اگر ہم اس میں کامیاب نہ ہوئے تو یہ کام اپنی اولاد کے سپرد کر جائینگے اور نسلوں تک یہ آگ بھڑکتی رہے گی۔

متحدہ اقوام کا نامناسب فیصلہ

عربوں کو اس فیصلہ کے خلاف بہت سی شکایتیں ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ متحدہ اقوام کی اسمبلی نے تقسیم فلسطین کے مسئلہ میں بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے کیونکہ جن ملکوں نے تقسیم کے حق میں رائے دی ہے ان کی آبادی ۲۰ کروڑ ہے اور جن ملکوں نے اس کے حق میں رائے نہیں دی یا جو غیر جانب دار رہے، ان کی آبادی ایک ارب ہے۔ اس لئے اگر تمام دنیا کی آبادی کی رائے کا لحاظ کیا جائے تو اکثریت تقسیم کے خلاف ہے۔ اسی کے ساتھ عربوں کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ سرزمین فلسطین کی تقسیم جس طرح کی گئی ہے وہ بالکل غیر منصفانہ ہے۔ فلسطین کی مجوزہ تقسیم سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے آپ اس کا نقشہ سمجھ لیں۔

(نقشہ صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ ہو)

اس نقشہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسطین کے آٹھ ٹکڑے کئے گئے ہیں۔ ایک ٹکڑا یروشلم اور اس کے حوالی کا ہے جو متحدہ اقوام کی کونسل کی ولایت میں رہے گا۔ تین ٹکڑے جو یہود کو دئے گئے ہیں ان میں دو ٹکڑے ایک دوسرے سے جدا ہیں، آٹھواں ٹکڑا بندرگاہ جافہ کا ہے جو دیا تو گیا ہے عربوں کو لیکن چاروں طرف یہودی علاقہ سے گھرا ہوا ہے۔

عربوں کی شکایات

عربوں کا کہنا ہے کہ جو حصے یہودیوں کو دئے گئے ہیں ان میں صرف ایک حصہ (الف) ایسا ہے جہاں یہودیوں کی آبادی زیادہ ہے۔ حصہ (ب) میں عربوں کی آبادی یہود سے تگنی ہے اور حصہ ج میں یہود کی آبادی دو ہزار سے زیادہ نہیں حالانکہ عرب آبادی کم از کم ۸۰ ہزار ہے اور اگر تینوں ٹکڑوں کی مجموعی آبادی کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ یہودی حصہ فلسطین میں ۵۵ یہود کے مقابلہ میں ۴۵ عرب آباد ہیں۔

دوسری شکایت عربوں کو یہ ہے کہ فلسطین کا تمام کوہستانی اور بے آب و گیاہ علاقہ ان کو دیا گیا ہے اور زرخیز علاقہ سب کا سب یہودیوں کے حصہ میں آیا ہے۔ حیفہ جو تنہا محفوظ بندرگاہ موسم سرما کا ہے وہ بھی یہودیوں کو دیا گیا ہے۔ فلسطین کی خاص پیداوار چکوترا ہے اور جس علاقہ میں یہ پیدا ہوتا ہے وہ تقریباً سب کا سب یہود کے حصہ میں آیا ہے۔ اسی طرح دوسرے اقتصادی اہمیت رکھنے والے حصوں سے بھی عرب محروم کر دئے گئے ہیں۔

فلسطین کے معاملہ میں جو خاص کمیٹی متحدہ اقوام نے مقرر کی تھی اسنے تقسیم فلسطین کرتے ہوئے اس کا اعتراف کیا ہے کہ عربوں کو جو حصہ ملک دیا جاتا ہے وہ پیداوار کے لحاظ سے ایسا نہیں کہ عرب آبادی کے لئے کفالت کر سکے، اور اسی لئے اس نے یہ سفارش بھی کی ہے کہ عربی فلسطین کو قرض وغیرہ کی صورت میں بین الاقوامی امداد ملنا چاہئے، اس کے معنے دوسرے الفاظ میں یہ ہیں کہ عرب فلسطین گویا بھکاریوں کا ایک ایسا ملک ہوگا جو محض یورپین اقوام کی خیرات پر زندہ رہ سکے گا۔

تقسیم ناقابل عمل ہے

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں اور تمام ممالک بخوبی واقف ہیں کہ فلسطین کی حقیقی تقسیم جو دونوں حصوں کی سیاست و اقتصادیات کو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ علیحدہ کر دے

کسی طرح ممکن نہیں ہے - سڑکیں، تار، ریل، بجلی، پانی اور تمام وسایل نقل و حرکت دونوں حصّوں کے اس طرح ایکدوسرے سے گتھے ہوئے ہیں کہ جب تک دونوں میں واقعی خلوص نہ پیدا ہو کام نہیں چلسکتا - مثلاً یروشلم کو لیجئے کہ یہاں کی آب رسانی کے لئے جن ذخایر سے کام لیا جاتا ہے وہ یہودی ریاست میں ہیں، لیکن پانی کے پائپ لگے ہوئے ہیں عرب ریاست میں، اس لئے اگر عرب و یہود دونوں متفق نہ ہوں تو یروشلم کو پانی کا ایک قطرہ نہیں مل سکتا - اسی بناء پر متحدہ اقوام کی کونسل نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ عرب و یہود دونوں ریاستوں میں "اقتصادی متحدہ یونین" قایم کی جائے جس میں یہودیوں، عربوں اور اقوام متحدہ کے تین تین نمایندے شامل ہوں اور نو ممبروں کی یہ کونسل متحدہ فلسطین کے اقتصادی نظام کی ذمہ دار ہو، لیکن عربوں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ نہ وہ تقسیم فلسطین کو مانیں گے اور نہ کسی اقتصادی کونسل میں شرکت کریں گے، جس کے معنے یہ ہیں کہ اگر یہودی ریاست علٰحدہ قایم ہوگئی تو اس کی ۵ لاکھ عرب آبادی ہر وقت بغاوت پر آمادہ رہے گی اور فلسطین سے باہر جو سات خود مختار ریاستیں عربوں کی ہیں وہ بھی یہود ریاست پر تاخت کرتی رہیں گی - یہودیوں کی آبادی فلسطین میں چھ لاکھ ہے اور عرب کی تمام خود مختار ریاستوں کی آبادی ۴ کروڑ ۸۰ لاکھ ہے - اول اول تو یہودی لیڈروں کو یقین تھا کہ عربوں کے مقابلہ میں یہودی فوجیں کافی ہونگی لیکن اب وہ متحدہ اقوام سے بھی فوجی امداد چاہتے ہیں - کیونکہ جب تک ایک لاکھ کے قریب منظم فوج نہ ہو وہ عربوں کے تاخت و غارتگری کا جس میں وہ بہت مشاق ہیں، سدّباب نہیں کرسکتے اور اتنی فوج تنہا یہود جماعت فراہم نہیں کرسکتی - علاوہ اس کے اگر متحدہ اقوام نے نفاذ تقسیم کے لئے فوج فراہم کردی تو بھی فلسطین کی گتھی نہیں سلجھ سکتی، بلکہ اس میں اور زیادہ پیچیدگی ہوجانے کا اندیشہ ہے، کیونکہ جس وقت عربوں کی تاخت روکنے کے لئے متحدہ اقوام کی فوجیں جو یوروپین اور امریکن افواج پر مشتمل ہوں گی، عرب حکومتوں کے حدود میں داخل ہوں گی تو تمام ایشیا میں یوروپ امریکہ کے خلاف غصہ کی لہر دوڑ جائے گی اور یوروپ و امریکہ کے جو اغراض مشرق وسطی سے وابستہ ہیں، ختم ہوجائیں گے - ان میں اہم ترین چیز پٹرول ہے جو سرزمین عرب کی بڑی دولت ہے اور جس پر قبضہ رکھنے اور پانے کے لئے برطانیہ اور امریکہ سب کچھ کرسکتے ہیں -

مشرق وسطی اور پٹرول

ڈاکٹر جوزف پوگ، جو پٹرول کے مسئلہ میں بہت بڑی سند سمجھا جاتا ہے کہتا ہے کہ:

"آیندہ دس سال کے اندر دنیا کا مطالبہ پٹرول کے لئے ۵۰ فی صدی بڑھ جائے گا اور مشرق وسطی کے پٹرول ذخایر دنیا کے مستقبل پر بہت زیادہ اثر انداز ہوجائیں گے

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک غیر ملکی پٹرول کمپنیاں مشرق وسطی میں ۱۶ ارب ۵۰ لاکھ ڈالر سرمایہ لگانے کے بعد ۱۹۵۱ء میں اس قابل ہوجائیں گی کہ روزانہ پندرہ لاکھ پیپے پٹرول کے حاصل کرسکیں اور یہ اتنی بڑی دولت ہے کہ اس کو نظر انداز کرکے نہ یوروپ پنپ سکتا ہے، نہ امریکہ اپنا مستقبل مضبوط کرسکتا ہے - خود مشرق وسطی کو اس سے یہ فایدہ پہونچے گا کہ ۱۹۵۱ء میں گیارہ کروڑ ڈالر رایلٹی کا اسے ملے گا اور اتنی ہی رقم وہاں کے مزدوروں اور کام کرنے والوں کو ملے گی،

گویا تقریباً چوتھائی ارب ڈالر سالانہ مشرق وسطیٰ کو ملتا رہے گا جس سے اس کی معاشی حالت بہتر ہو جائے گی - اس لئے اگر فلسطین کے قضیہ میں امریکہ و برطانیہ مشرق وسطیٰ کے پٹرول سے محروم ہو گئے تو یہ ان کے لئے بھی ناقابل تلافی نقصان ہوگا اور مشرق وسطیٰ کے لئے بھی۔

روس کا نقطۂ نظر

اسی سلسلہ میں روس کے نقطۂ نظر کو بھی سامنے رکھئے۔ وہ عرصہ سے تمنا کر رہا ہے کہ خلیج فارس میں اسے کوئی بندرگاہ ملجائے، کیونکہ موسم سرما میں اس کے تمام بندرگاہ معطل ہو جاتے ہیں اور گرم سمندر میں اس کی کوئی بندرگاہ نہیں ہے۔ لیکن اس کی یہ تمنا اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب امریکہ و برطانیہ کے اثرات یہاں ضعیف ہوں اور اسی لئے اس نے تقسیم فلسطین کے حق میں رائے دی - امریکہ نے پہلے تو اس لئے رائے دی تھی کہ صدر امریکہ یہودیوں کی ہمدردی و اعانت حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن بعد کو روس کی نیت کا حال معلوم کر کے اپنی رائے تقسیم فلسطین کے باب میں واپس لے لی۔

اس بات کے سمجھنے کے لئے کہ تقسیم فلسطین سے روس کا کیا فایدہ ہے، خود عرب ریاستوں کے خیالات روس کے متعلق معلوم کرنا ضروری ہیں۔

یہ خیال کرنا کہ عرب آبادی امریکہ کے ہاتھ اپنے آپ کو فروخت کر چکی ہے اور روس کی مخالف ہے، درست نہیں - کیونکہ اول تو روس میں تین کروڑ مسلم آبادی کا وجود عربوں کو روس کی طرف مایل کرنے پر مجبور ہے، دوسرے وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ روس اس وقت یہودیوں کی مدد صرف اس لئے کر رہا ہے کہ فلسطین میں اشتراکیت کو پھیلائے، لیکن آخرکار روس کو عرب ریاستوں ہی سے سمجھوتا کرنا پڑے گا، کیونکہ ان کے پاس پٹرول ہے اور ہندوستان کی طرف بڑھنے کے لئے وہ وسیع ساحل بھی رکھتے ہیں۔ اور اگر امریکہ کے ایک ماہر مسایل شرقیہ کا بیان صحیح ہے تو عرب ریاستوں کا آیندہ کسی وقت روس سے معاملہ کر لینا بعید از قیاس نہیں۔

تقسیم فلسطین کے مسئلہ میں روس کی ایک اور غرض بھی شامل ہے، وہ یہ کہ اگر فلسطین کے دو ٹکڑے کر کے یہود ریاست قایم کر دی گئی، تو یہ بنیاد ہوگی اس امر کی کہ ترکی کے بھی دو ٹکڑے کر کے آرمینیا کو علٰحدہ کر دیا جائے اور ایران سے آذربیجان کو جدا کر کے اسے جداگانہ ریاست بنا دیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ ریاستیں علٰحدہ ہو کر سوویٹ یونین ہی میں شامل ہوں گی۔ دوسرا فایدہ روس کو تقسیم فلسطین سے یہ پہونچے گا کہ یہود و عرب کی باہمی مخالفت کی وجہ سے پٹرول کی فراہمی یورپ کو کم ہو جائے گی اور اس طرح امریکہ کا مارشل پلان بیکار ہو جائے گا ـــــ ان حالات میں غور کرنا چاہئے کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا یہ فیصلہ کہ تقسیم فلسطین کے لئے فوجی قوت بھی استعمال ہو سکتی ہے کس حد تک قابل عمل ہے اور حفاظتی کونسل اس پر عمل کریگی یا نہیں۔

ترکی کے اندیشے

قریب دو ہزار کے اکن ملکوں میں جو فلسطین کے اندر بین الاقوامی فوج کی مداخلت کو پسند نہیں کر سکتے ترکی اور یونان بھی ہیں اور اسی لئے انھوں نے تقسیم کے خلاف اپنی رائے دی تھی۔ ترکی کی

مخالفت کا سبب یہ ہے کہ اس کی مشرقی و شمالی سرحد روس سے ملی ہوئی ہے اور مغربی سرحد بھی بلغاریا کی وجہ سے گویا روس ہی سے قریب ہے، اس لئے اگر متحدہ اقوام نے اپنی فوج وہاں بھیجی اور روس نے بھی اپنی فوج بھیجنے پر اصرار کیا تو جنوبی سرحد پر بھی روسی فوجیں آجائیں گی اور اس طرح روس چاروں طرف سے ترکی کو گھیر لیگا۔

امریکہ، ترکی کے اس اندیشہ کو اس طرح دور کرنا چاہتا ہے کہ اگر روس نے فلسطین میں اپنی فوجیں لانے پر زور دیا تو وہ ویٹو کے اختیار سے کام لیکر روس کے اس مطالبہ کو رد کردے گا اور خود بھی اپنی فوجیں نہ بھیجے گا بلکہ چھوٹے چھوٹے ملکوں کی فوجیں طلب کرے گا۔ لیکن امریکہ کو شاید معلوم نہیں کہ خواہ وہ اپنی فوجیں بھیجے یا دوسرے ملکوں کی، دونوں صورتوں میں عربوں پر اس کا ردّ عمل ایک ہی ہوگا اور وہ امریکہ سے اپنے دوستانہ تعلقات ختم کرکے پٹرول سے اسے محروم کردیں گے اور یہی وہ خیال تھا جس کی بنا پر امریکہ نے اپنی رائے تقسیم فلسطین کے مسئلہ میں واپس لیلی ہے۔

مستقبل کے اندیشے

بہرحال فلسطین کے مسئلہ کو صلح و آشتی سے طے کرنا، برطانیہ و امریکہ کی انتہائی خواہش ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ کو جنگ کی آگ سے محفوظ رکھیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہود اور روس اس خواہش میں انھیں کامیاب ہونے دیں گے یا نہیں، اس کا جواب صرف مستقبل کے واقعات پر منحصر ہے۔

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کردینے والی

انجیلِ انسانیت

"من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام نوع انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ ضخامت ۶۰۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

گرد پوش رنگین — منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ — کاغذ سفید و دبیز

لکھنؤ اور دہلی کی شاعری

شاعری پر تنقید کرتے وقت اس اصول کو سامنے رکھنا ضروری ہے کہ شاعری کو ملکی، تمدنی و معاشرتی حالات سے بڑا تعلق ہے اور یہ کہ ان حالات کے ساتھ ساتھ شاعری کے رجحانات بھی بدلتے جاتے ہیں۔ عاشقانہ جذبات کی گرم بازاری تخئیل کی بلند پروازی، صوفیت کا شور، رزمیہ کا زور، نازک خیالی کی صنعت گری وغیرہ سب ماحول کے نتیجے ہوا کرتے ہیں — دیکھئے دہلی کا ستارہ گردش میں ہے، رئیسوں کی دولت خاک میں مل چکی ہے۔ اس آشوب روزگار میں شاعر اپنی تباہی کی داستان یوں بیان کرتا ہے:

اتنا میں کیا عرض کہ فرمایئے حضرت — آرام سے کٹنے کی کوئی طرح بھی یاں ہے
سنکر یہ لگا کہنے کہ خاموش ہی رہ جا — اس امر میں قاصر تو فرشتہ کی زباں ہے
کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانے کی کٹی شکل — ہے وجہ معاش اپنی سو جسکا یہ بیاں ہے
گھوڑا ہے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی — تنخواہ کا پھر عالم بالا یہ نشاں ہے
گزرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر — شمشیر جو گھر میں تو سپر بنئے کے یاں ہے
ثابت ہو جو دگلا تو نہیں موزوں میں کچھ حال — تیروں میں ہے پرگیری تو بے چلہ کماں ہے
کہتا ہے نفر غرہ کو صراف سے جا کر — بی بی نے تو کچھ کھایا ہے فاقہ سے میاں ہے
یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ — شوال بھی پھر ماہ مبارک رمضاں ہے

سودا

یہی شاعر جب لکھنؤ آتا ہے اور شجاع الدولہ کو نبرد آزمائی میں مشغول پاتا ہے تو یوں جھوم جھوم کے رجز پڑھتا ہے:

آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار — دیکھا جسے نہ ترک فلک نے بروزگار
گجناں مثل رعد کے کڑکے تھی دمبدم — آواز شتر ناں تھی طاؤس کی جھنکار
بارود و گولہ توپ میں تھا یا وہ باد تھی — جس نے کہ قوم عاد اُڑائی تھی جوں غبار

یہی شاعر آصف الدولہ کے زمانے میں جب سونے چاندی کے دریا بہتے دیکھتا ہے تو یوں قصیدہ خوانی کرتا ہے:

گر فلک اب یہ مہرباں ہوئے — جوں تگرگ ابر درفشاں ہوئے

دخل کیا ہے کہ اس کے چلنے کا — کسی انسان پر گماں ہوئے
خلق کو اس قدر ہے استغنا — نہیں ممکن کہ وہ بیاں ہوئے
رہرو آگے اگر پڑا ہو گہر — دور ٹھوکر سے کر رواں ہوئے
کبھو دیکھا نہ یوں کہ زر بے قدر — اس قدر زیر آسماں ہوئے
رہ نوردوں کی نظروں میں اکسیر — بدتر از گرد کارواں ہوئے
در گنجینہ پر نہیں اب رسم — کنجی و قفل و پاسباں ہوئے
جو گدا روز و شب کہ سائل تھا — چاہئے رشک خسرواں ہوئے
در و دروازہ یوں ہے اب کس کا — کہ نہ واں پیل و پیل باں ہوئے
عیش و عشرت سے ہے سدا دمساز — پیر ہو کوئی یا جواں ہوئے
ہے جو کچھ جس کے ہے اسکی عطا — آصف الدولہ اور جہاں ہوئے

ان مثالوں سے واضح ہے کہ شاعر وہی کہتا ہے جو اپنے دائیں بائیں دیکھتا ہے، اور اگر تنقید کے اس مسلم اصول کو سامنے رکھ کر آپ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا جائزہ لیں گے تو دونوں جگھوں کی شاعری کے اصلی خال و خط سامنے آجائینگے

دہلی کی شاعری کے ترکیبی اجزاء

دہلی کی شاعری کے ترکیبی اجزاء دریافت کرنے کے لئے یہ عبرت خیز اور درد انگیز داستان سننا ضروری ہے کہ دہلی میں شاعری شروع ہوتے ہی قتل و غارت کے ایسے سخت زلزلے آئے کہ اس کی تاریخی آن بان اور شوکت و شان کی فلک بوس عمارت زمین کے برابر ہو گئی۔ ناز و نعم کی گود میں پل کر جوان ہونے والے پوتڑوں کے رئیس اور غالیچوں کے امیر روٹیوں کو محتاج ہو گئے۔ ہر وقت لٹ جانے کا کھٹکا اور قتل ہونے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ آج درانیوں نے لوٹا تو کل پنڈاریوں نے۔ پرسوں روہیلوں نے تاراج کیا تو نرسوں بندیلوں نے۔ کبھی سکھوں نے تاخت کی کبھی مرہٹوں نے۔ کبھی جاٹوں نے غارتگری کی کبھی راجپوتوں نے غرض ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی جنگ جو قوم ایسی نہ تھی جس کے گھوڑے دہلی میں نہ دوڑا کرتے ہوں۔ اس بے بسی اور مفلسی میں جس کو جہاں امن کا گوشہ ملا وہیں چھپ رہا جو رہ گئے ان پر افسردگی و پژمردگی چھائی رہی، زندہ دلی یک قلم مفقود ہو گئی اور عشق و عاشقی کے جذبات یکسر فنا۔ لیکن انسان کسی حالت میں ہو فطری میلانات ضرور غالب آتے ہیں اور اس زمانہ میں یہ جذبات امرد پرستی کی صورت میں ظاہر ہوئے اور اس شدت کے ساتھ کہ اس کے اظہار میں میر ایسے برگزیدہ شخص نے بھی پرسرام کے عشق کا قصہ لکھ ڈالا۔ میر کے علاوہ دوسرے شاعروں کا حال بھی سنئے:

مصحفی نے اپنے تذکرہ میں فدوی کے متعلق لکھا ہے:

"قدم در راہ امرد پرستی میگذاشت چند جا خانہ جنگی ہم کردہ بکو دکان حسین تعشق ورزیدہ"

میر حسن کے تذکرہ میں ایسے بہت سے پاکبازوں کا ذکر موجود ہے:

صلاح الدین پاکباز :- "برسوھنا دنکھن کہ قوال بچہ بود نظر الفتی داشت"

میر احمد یار :- "جوانے بکمال وجاہت وملاحت کہ یوسف ثانی تواں گفت دراں زماں عالم فریفتۂ رخ نیکو و آشفتہ زلف او بود در وقت احمد شاہ ہنگامہ حسن او گرم بود ایں ہمہ شعرائے متوسطین میر مانند پروانۂ دل خود را بر شعلۂ حسنش می سوختند و نیز با نہا صحبت می داشت - اکثر اصلاح سخن از میر محمد تقی سلمہ اللہ می گرفت - میر ضیاء سلمہ اللہ نظر الفت داشتند چنانچہ تا حال ہر کہ یاد او می کردند می گریند"

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے تمام شعراء اس آتشکدہ کے پجاری تھے مثلاً :-

جعفر علی خاں زکی :- "سوائی رام راجہ بود باد تعشق داشت"

میر افضل افضل :- "ہندو بچہ گوپال نامی بود کہ برد عاشق شدہ"

عبدالحی تاباں :- "با یک طفلے سلیمان نامی تعشق داشت"

نور اللہ :- "بریک فرنگی بچہ تعشق ہم رسانیدہ"

میر رضا علی رضا :- "شیخے وہب علی عاشق است"

سلیمان :- "معشوق عبدالحی تاباں است"

تذکرہ گلزار ابراہیم کا مصنف ان شاعروں کے علاوہ مہتاب رائے رسوا اور محمد چاند رخشاں کا ذکر بھی اسی سلسلہ میں کرتا ہے - اسی فضا میں دہلی کی صوفیانہ شاعری کو ترقی ہوئی جو اکثر امرد پرستی کا بہانہ ہوتی ہے - چنانچہ جب تاتاریوں نے اسلامی دنیا کو تہ و بالا کر دیا - خوارزمیوں کی سلطنت خاک میں ملادی اور بنو عباس کی پانچسو برس کی سلطنت برباد کر دی اور بڑے بڑے دار السلطنتوں میں خاک اڑنے لگی، امیر زادے اور وزیر زادے بھیک مانگنے لگے - تو اس زمانہ میں بھی تصوف اور امرد پرستی کی شاعری کا رواج زیادہ ہو گیا -

مولانا شبلی نے تاتاریوں کی غارت گری کے بعد صوفیت اور امرد پرستی کی داستان اس طرح بیان کی ہے :

"اس زمانہ میں امرد پرستی کا عام مرض پھیلا ہوا تھا - صوفیہ اور اہل نظر اس کو عشق حقیقی کی منزل اولین قرار دیتے تھے اور ارباب ذوق کے لئے تفریح خاطر کا اس کے سوا کوئی سامان نہ تھا شیخ (سعدی) چونکہ اس سانپ کو کھلا چکا تھا اس کی مسرتوں سے خوب واقف تھا، اس لئے اس نے نہایت سختی سے اس کی برائیاں کی ہیں"۔

اسی کتاب کے صفحہ ۶۳ پر لکھتے ہیں :- "ریاکار عالموں کی قلعی سب نے کھولی ہے لیکن صوفیہ کا گروہ جو ہمہ تن ریاکار ہے ان کی نسبت کسی کو ریاکاری کا گمان بھی نہیں ہوتا اور ہو بھی تو عوام کے ڈر سے ظاہر نہیں کر سکتا - شیخ اس راز سے خوب واقف تھا اس لئے اس نے نہایت دلیری سے اس طلسم کو توڑا ہے، غزلوں میں نہایت لطیف پیرایوں میں اس مضمون

کو ادا کیا ہے:

بروں نمی رود از خانقہ یکے ہشیار کہ پیش شحنہ بگوید کہ صوفیاں مستند
محتسب در قفائے رندان است غافل از صوفیان شاہد باز

پھر صفحہ ۹، پر لکھتے ہیں:- "شیخ پہلا شخص ہے جسنے زاہدوں اور واعظوں کا پردہ فاش کیا ہے اور ریاکاری کی دقیق اور باریک کارسازیوں کی قلعی کھولی ہے۔ خیام نے رباعیوں میں اس مضمون کو ادا کیا تھا لیکن صاف صاف اور کھلے لفظوں میں شیخ کی طرح چبھتی ہوئی چوٹیں نہ تھیں جن سے ریاکاروں کے دل برا جائیں"

بالکل یہی حالت اس وقت دہلی والوں کی تھی۔ تباہی و بربادی سے غم والم کی گھٹا ہر دل پر چھائی ہوئی تھی اس لئے ادھر تو صوفیانہ شاعری کو عروج ہوا ادھر امرد پرستی کو ترقی ہوئی جس کی مثالیں میر، درد اور آبرو وغیرہ کے کلام میں کافی ملتی ہیں۔ شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ نے فیض آباد کو خیر باد کہکے لکھنؤ آباد کیا تو یہ سجی سجائی محفل معہ اپنے تمدن کے یہاں جمی، داد و دہش اور قدر دانی کی کشش نے آس پاس کے بچے کھچے لوگوں کو بھی کھینچ لیا اور تھوڑی ہی دنوں میں یہ شہر عقل و دانش میں یونان کا خطہ اور زیب و آرائش میں بہشت کا نمونہ بن گیا۔ گلشن ہند کا مؤلف لکھتا ہے کہ: "ایک ایک کمال کا ہزار ہا آدمی حاضر تھا" عمارت کی طرف اتنی توجہ تھی کہ ہر روز ایک نئی عمارت کی بنیاد رکھی جاتی تھی۔

آصف الدولہ چونکہ سخی بھی تھے اس لئے انھوں نے ارکان سلطنت کو عیش پرستی بھی سکھائی اور لکھنؤ دولت کا گھر اور عیش کا مستقر بن گیا۔

نواب شاعر بھی تھے اور بہت پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ شعر و شاعری بھی عیش پرستی کا ایک ضروری جزو ہوتی ہے اس لئے شعراء کی قدر دانی اور سرپرستی بھی دل کھول کے کی گئی۔ دولت کی اس فراوانی اور ہنر کی اس قدر دانی نے دہلی کے رہے سہے لوگوں کو بھی کھینچ بلایا۔

علمائے فرنگی محل، اورنگ زیب کے زمانہ سے لکھنؤ میں علمی مسند بچھائے ہوئے بیٹھے تھے اور یہاں کا درس نظامی عراق و ایران تک ہی جاری تھا۔ اس کے بعد مولوی سید دلدار علی (جو مرنے کے بعد غفران مآب کے لقب سے مشہور ہوئے) نے فرنگی محل کے مقابلہ میں اپنی مسند الگ بچھائی اور شیعوں کی جماعت قایم کی۔

شاعروں کا بھی ایک زبردست مجمع تھا درد، میر، سودا ایسے استاد زمانہ اسی زمانہ میں آئے اور میر حسن کی مشہور مثنوی اسی عہد میں لکھی گئی۔

شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ نے فوج تو کم کردی مگر سپاہیوں کا ٹھکانا سوا لکھنؤ کے کہیں اور نہ تھا۔ اس لئے وہ شاہی نوکری سے علٰحدہ ہونے کے بعد بھی لکھنؤ میں رہ کے رئیسوں کی سرکار میں کھپ گئے۔ اس طرح فوج کم ہونے کے بعد بھی لکھنؤ میں سپاہیوں کی زیادتی رہی۔ اور فن سپہ گری یہاں ترقی کرتا رہا رئیسوں سے لیکے عاملوں تک سپہ گری کے فن میں کامل

ہوتے تھے - بانک، جل بانک، کشتی، بنوٹ، برچھا، بانا، تلوار، کٹار، تیراندازی، شہ سواری ایسے ہنر تھے جن کا جاننا ہر شریف آدمی کو ضروری تھا - ان فنون میں کمال رکھنے سے بڑھ کے کہیں نہ تھے -

شجاع الدولہ کے وقت سے ارباب نشاط اور گانے والیاں دہلی اور دور دراز مقامات سے آکے فیض آباد میں بس گئی تھیں جو آصف الدولہ کے ساتھ آئیں ——— اور شاہد پرستی عام ہو کر رئیسوں کی وضع میں داخل ہو گئی -

موسیقی کو اتنا عروج ہوا کہ لکھنؤ اس کا ایک بڑا مرکز بن گیا اور علم و دانش کے پرستاروں نے اس کے آگے سر نیاز جھکایا حکومت اودھ کے مشہور منصب دار تفضل حسین خاں کے متعلق آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ ابوالفضل کے بعد اگر کسی کو علامہ کا خطاب زیب دیتا ہے تو وہ تفضل حسین خاں ہے - یہ موسیقی کے بھی زبردست ماہر تھے -

ہر چیز میں نفاست اور تکلف پیدا کرنے کا شوق شجاع الدولہ کے زمانہ سے چلا آرہا تھا اور یہاں کی معاشرت کا خاص جزو تھا - اسوقت لکھنؤ کا تمدن یہ تھا :— رفتار گفتار میں سنجیدگی و متانت، وضع قطع میں پاکیزگی و نفاست - سپہ گری میں مہارت - شاعری کا شوق - موسیقی کا ذوق - عربی علوم کا رواج - رئیسوں کے دربار سے طبیب، شاعر، سپاہی داستان گو، مصاحب، مسخروں اور کسبیوں کی وابستگی -

سعادت علی خاں کے بعد غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کا دور حکومت آیا تو تمام سیاسی ہچکیاں دور ہو گئیں - یہی وہ زمانہ ہے جب لکھنؤ کی خصوصیات مستقل طور سے نمایاں ہوئیں اس زمانہ میں فرمانروائے لکھنؤ نے شاہی تاج زیب سر کیا اور دلی کی اطاعت سے آزادی کا اعلان کیا - ادھر ناسخ نے زبان کی اصلاح کر کے اردو کا ایک الگ معیار معین کیا اور دہلی نے مقابلہ میں اپنی درسگاہ الگ قایم کی جس نے دہلی کی زبان و شاعری پر بھی اثر ڈالا اور تمام ہندوستان نے اس کا اثر قبول کیا -

اس فضا میں لکھنؤ کی شاعری کا جو ڈھانچا بن کے تیار ہوا وہ یہ تھا کہ :

(۱) عیش و عشرت نے یاس و حسرت کے بجائے مسرت آمیز مضامین کے لئے راستہ کھولا - (۲) معاشرت کی نزاکت پسندی نے زبان میں لوچ اور نزاکت پیدا کی اور تخیلی شاعری کو عروج دیا — (۳) معاشرت میں تکلفات کی زیادتی نے صنعتوں کے استعمال کو ترقی دی — (۴) عورتوں کے ساتھ دلچسپی نے دنیاوی عشق و محبت کی داستان بیان کرائی جس کی وجہ سے مثنوی کو فروغ ہوا - غزل میں معاملہ بندی اور معشوق کے زلف و رخ - خال و خط کا ذکر کثرت سے کیا گیا — (۵) علماء کی کثرت اور عربی علوم کی ترقی نے فلسفیانہ مضامین کو راستہ دیا — (۶) تہذیب و متانت کی پابندی اور اخلاق کی بلندی نے مبتذل اور بازاری مضامین کو خارج کیا — (۷) شیعیت کے اثر سے مرثیہ، سلام، نوحہ اور رباعی کو ترقی ہوئی - (۸) سپاہیانہ اسپرٹ نے مرثیہ میں رزمیہ مضامین کا اضافہ کیا -

لیکن یہ کہنا کہ لکھنؤ کی شاعری معشوق کے زلف و رخ کی تعریف تک محدود ہے صحیح نہیں بلکہ اہل لکھنؤ نے ان تمام مضامین کو معراج تک پہونچایا ہے جو انسان کو انسان بنا سکتے ہیں ـــ فلسفیانہ شاعری کو عروج دیا جو دقیق خیالات کو آسانی سے ذہن نشین کر سکتی ہے ـــ رزمیہ شاعری کو بلند کیا جو شجاعت - اولوالعزمی - حمیت - غیرت - عزت نفس کے جذبات پیدا کر سکتی ہے - عشقیہ شاعری کو وسعت دی جس سے دل کو زندگی اور روح کو تازگی حاصل ہوتی ہے ـــ تخیلی شاعری کو معراج تک پہونچایا جس سے طبیعت کو اہتزاز و انبساط حاصل ہوتا ہے - دہلی کے وہ شاعر جن کی عمر یں آہ و زاری میں گزری تھیں اس ماحول میں اُن کے لب بھی تبسم سے آشنا ہو گئے اور دلوں میں زندگی کے آثار پائے جانے لگے اور کچھ دیر کے لئے نالہ و فریاد چھوڑ کے یہ ترانے گنگنانے لگے :

میرا ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہئے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اس کے بعد دہلی میں جو دور شروع ہوا وہ لکھنؤ سے بہت متاثر تھا اور حقیقت میں لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کا امتزاج تھا - لیکن آخری دور جس نے داغ کو پیدا کیا تھا وہ لکھنؤ کی شاعری کا بالکل چربہ تھا جو لکھنؤ کی مرصع سے عاری اور دہلی کی بازاری شوخی کا سورما تھا لکھنؤ کا شاعر بے پایاں مستی میں بھی یہ نہ کہہ سکے گا :

قیامت ہیں بانکی ادائیں تمہاری ادھر آؤ لے لوں بلائیں تمہاری

لکھنؤ کی شاعری پر اعتراض

لکھنؤ کی شاعری پر عموماً یہ اعتراض کئے جاتے ہیں :-

(۱) لکھنؤ کے تمدن میں زنانہ پن پیدا ہو گیا تھا - اس لئے وہاں کی شاعری میں نسائیت پیدا ہو گئی ـــ (۲) ایہام و لفظی مناسبت کی شاعری نے جذباتی لطف کو تباہ کر دیا -

ان اعتراضوں پر غور کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اصناف سخن میں کون کون سی صنفیں متداول ہیں اور ان میں لکھنؤ اور دہلی نے کن کن صنفوں کو ترقی دی ـــ اس سوال کے جواب میں ذیل کی صنفیں پیش کی جا سکتی ہیں :-

(۱) سہرا - (۲) غزل - (۳) قصیدہ - (۴) رباعی - (۵) قطعہ - (۶) سلام - (۷) مرثیہ - (۸) نوحہ - (۹) واسوخت - (۱۰) ریختی

غزل - غزل کے سلسلہ میں جب ہم غور کرتے ہیں تو لکھنؤ اور دہلی دونوں میں توازن پایا جاتا ہے - اگر درد، میر، سودا، مصحفی، انشاء، نصیر، ذوق، غالب، مومن، شیفتہ اور داغ نے دہلی میں غزل کی زمین کو آسمان بنایا تو ناسخ، آتش، اسیر، جلال، امیر، شرف، ماہر، جاوید، نظم، رسوا، صفی، آرزو، عزیز، محشر، ثاقب اور اثر نے لکھنؤ میں غزل کو معراج تک پہونچایا -

قصیدہ - قصیدہ میں اگر سودا، ذوق، غالب اور مومن دہلی کے انوری و خاقانی ہیں تو منیر، صفی، عزیز، محشر لکھنؤ کے عرفی و قاآنی ہیں - ان صفتوں میں لکھنؤ کے شاعروں کا منتخب کلام دہلی کے شاعروں کے منتخب کلام سے کسی طرح کم رتبہ نہیں رکھتا - اگر دہلی والوں کو کچھ فضیلت دیجا سکتی ہے تو صرف تقدم میں شاعرانہ کمال میں نہیں اور شاعری کی بعض قسمیں ایسی ہیں

جن میں لکھنؤ والے منفرد نظر آتے ہیں ان میں مرثیہ کو خاص اہمیت حاصل ہے -

رزمیہ شاعری جہاں تک غور کیا جاتا ہے تمام اصناف سخن میں رزمیہ کا مرتبہ سب سے بلند ہے - اُردو میں رزمیہ نظم مرثیہ ہے جو اپنی وسعت کے لحاظ سے تمام اصناف سخن کو اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہے -

دُنیا کی دوسری زبانوں میں عظیم الشان نظمیں جن کی زبان اور خیالات نے اپنے اپنے ملک اور قوم کی ذہنیت، اخلاق اور عادات کی اصلاح کی ہے ہیں : —

(۱) ایلیڈ - (۲) پیراڈائز لاسٹ - (۳) مہابھارت - (۴) رامائن - (۵) شیکسپیر کے بعض ڈرامے - (۶) شاہنامہ -

لیکن ان سب شاہکاروں پر لفظی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے انیس کے کلام کو فوقیت حاصل ہے -

ہومر کی ایلیڈ میں سولہ ہزار - ورجل کی تصنیف میں دس ہزار - والمیک کی رامائن میں اڑتالیس ہزار - فردوسی کے شاہنامہ میں ساٹھ ہزار سے زیادہ شعر نہیں ہیں، لیکن انیس کا کلام ایک لاکھ سے زاید اشعار پر مشتمل ہے -

ایلیڈ کے افراد باعظمت نہیں ان کی ذاتی خوبیاں دلوں کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتیں - مہابھارت کسی خاص فکر کا نتیجہ نہیں ہے اس کی ترتیب و تہذیب متعدد دماغوں کی کاوش سے صدیوں کی کوشش میں ہوئی - پیراڈائز لاسٹ کا موضوع عظیم الشان نہیں ہے - شیکسپیر کے ڈرامے اور فردوسی کے شاہنامہ کا موضوع اتنا وسیع ہے اور ان میں اتنی متفرق ہستیاں کام کرتی نظر آتی ہیں کہ پڑھنے والا کسی ایک کے ساتھ کامل ہمدردی پیدا نہیں کر سکتا - ہاں رامائن کا موضوع بے شک اعلیٰ ہے اس نے ہندوستان کے ادب و اخلاق کی درستی میں زبردست حصہ لیا ہے اور اس کے رجال داستان بھی باعظمت ہیں لیکن اس میں مرثیہ کی سی وسعت اور رنگا رنگی نہیں - اس کے علاوہ اُردو کی رزمیہ نظم صرف انیس ہی کے مرثیوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اور شاعروں کے مرثیے بھی داخل کرنا پڑیں گے - اس صورت میں اُردو کی رزمیہ نظم بیس لاکھ اشعار سے کم کی سرمایہ دار نہیں ہے اور دُنیا کی کسی زبان میں رزمیہ کا اتنا ذخیرہ موجود نہیں ہے ایک لاکھ سے زائد انیس کے اشعار اور اس سے زیادہ دبیر کے - انیس کے خاندان میں مونس - اُنس - نفیس - وحید - رشید - عارف - عروج - فائز - فائق - کے مراثی بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کئے جا سکتے -

دبیر کے خاندان میں اوج اور رفیع -

خاندان اجتہاد میں امید - خورشید - ماہر - جاوید - ذاکر - حسین - آشفتہ -

دوسرے خاندانوں میں ضمیر - عشق - تعشق - فصیح کامل وغیرہ کے مرتبہ بڑی عظمت کے مستحق ہیں -

ہم فارسی کے گرشاسپ نامہ، سام نامہ، فرامرز نامہ، برزو نامہ، شہریار نامہ، سکندر نامہ[1] خاور نامہ - تیمور نامہ - ہمایوں

---

[1] اس نام کی کئی رزمیہ داستانیں لکھی گئی ہیں جن میں نظامی کی مثنوی سب سے زیادہ مشہور ہے -

اکبر نامہ - جہانگیر نامہ - شاہجہاں نامہ - شاہنامہ[1]، شاہنامہ نادری - شاہنشاہ نامہ[2] - ظفر نامہ، عادل نامہ - فتح نامہ - حملۂ حیدری - تاج الفتوح، تغلق نامہ - بہمن نامہ - آئینہ سکندری وغیرہ سے بے خبر نہیں ہیں - یہ سب کتابیں اپنے موضوع کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں - سوائے حملۂ حیدری کے اور کتابوں کے افراد ایسی شخصیتیں نہیں رکھتے جن کا تعلق نفس انسانیت سے ہو - زبان و بیان کے لحاظ سے بھی سوائے سکندر نامہ کے نظامی کے اور کسی کو کوئی درجہ حاصل نہیں ہے برخلاف اس کے اُردو کی رزمیہ نظم کا مرتبہ دوسری زبانوں کی رزمیہ سے کہیں بلند ہے اور اُردو شاعری میں جو کچھ وزن پیدا ہوتا ہے وہ مرثیہ سے اور مرثیہ میں اس طرز خاص کے موجد تنہا اہل لکھنؤ ہیں اور وہ تنہا لکھنؤ کی ملک ہے -

مثنوی - مرثیہ کے بعد جس صنف کو لکھنؤ والوں نے عروج دیا وہ مثنوی ہے جس کی وسعت کی کوئی حد نہیں، تاریخی حیثیت سے اس کی ابتداء دکن میں ہوئی اور سب سے پہلی عشقیہ مثنوی دس سو آٹھ ہجری میں ملا وجہی نے قطب مشتری تصنیف کی، اسکے بعد دکن میں کثرت سے مثنویاں تصنیف و ترجمہ ہوئیں -

شمالی ہند میں میر و سودا جیسے کامل اُستادوں نے مثنویاں لکھیں مگر کوئی مقبول نہ ہوئیں یہاں تک کہ وہ وقت آگیا کہ لکھنؤ شاعری کا مرکز ہوا اور میر حسن کی بے نظیر مثنوی ظہور میں آئی - میر حسن اگرچہ دلی میں پیدا ہوئے لیکن اتنی کمسنی میں وہ لکھنؤ چلے آئے اور اتنے دن یہاں رہے کہ ان کو لکھنوی کہتے میں تامل نہیں ہو سکتا - اگر میر اور غالب دہلوی تھے اور ناسخ، رند و میر لکھنوی میر حسن کو لکھنوی کہنے میں کسے عذر ہو سکتا ہے اور اس میں تو گفتگو کی گنجایش ہی نہیں کہ یہ مثنوی انھوں نے لکھنؤ میں کہی اور وہیں کے طرز معاشرت کی تصویر کھینچی ہے - اس لئے یہ مثنوی ہر اعتبار سے لکھنؤ کی ملکیت ہے -

اس کے بعد پنڈت دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم لکھی جو لفظوں کے انتخاب، تشبیہوں و استعاروں کی ندرت، لفظی و معنوی صنعتوں و مصرعوں کی برجستگی اور بندش کی چستی کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر ہے -

نواب مرزا شوق نے زہر عشق میں اپنی داستان فطری لب و لہجہ میں اس خوبی و اختصار سے بیان کر دی ہے کہ اُردو کی کوئی مثنوی ان خوبیوں میں اس سے ٹکر نہیں کھاتی -

آفتاب الدولہ قلق نے طلسم اُلفت ایسی موثر زبان میں لکھی ہے کہ اُردو میں کسی مثنوی کو ایسی زبان نہیں ملی -

احمد علی شوق نے سب سے آخر میں عالم خیال تصنیف کر کے دُنیا کو حیرت میں ڈال دیا - نادر تشبیہیں - نازک استعارے، بلیغ کنائے

---

[1] یہ شاہنامہ وہ نہیں ہے جس کا نامور مصنف فردوسی ہے بلکہ اس شاہنامہ کا مصنف کمالی سبزواری ہے اور اسی نام کی ایک مثنوی مرزا ولی تلی بیگ ولی نے چالیس ہزار بیت کی لکھی ہے یہ مصنف ہندوستان بھی آیا تھا یہاں اس نے عالیجاہ اور ذوالفقار خاں کی جنگ بھی نظم کی تھی

[2] اس نام کی بھی دو مثنویاں ہیں ایک ایران میں فتح علی شاہ کے زمانہ میں لکھی گئی دوسری ہندوستان میں عہد شاہجہانی کی تصنیف ہے -

[3] اس نام کی بھی دو مثنویاں ہیں ایک کا مصنف ملا رفیع بافقی اور دوسری کا ملا جان علی کرمانی ہے -

لطیف اشارے، زبان و بیان کی نزاکت - قدرت کے مناظر - فطرت کے جذبات - اصلیت - متانت - توازن - کامیاب مصوری اختصار - ایسے اوصاف ہیں جو مجموعی حیثیت سے اُردو کی کسی مثنوی کو نصیب نہیں - انھیں خوبیوں کی وجہ سے اہلِ نے اس کو انگریزی کی بلند پایہ نظموں سے بہتر بتایا ہے - یہ مثنوی موجودہ زمانہ کا ایک بڑا کارنامہ ہے اور اگر مذہبی و اخلاقی - مثنویوں کو بھی شریک کرلیا جائے تو میر کی مثنوی معراج المضامین اور مولانا صفی کی مثنوی تنظیم الحیات کا جواب اُردو میں نہیں ہے - بہرحال اتنا سب کو تسلیم ہے کہ اُردو کی بہترین مثنویاں لکھنؤ میں تصنیف ہوئیں اور اس صنف کو ترقی دینے والے صرف اہل لکھنؤ ہیں - یہی حالت قومی اخلاقی اور منظریہ نظموں کی ہے جن کو لکھنؤ میں بہت ترقی ہوئی اور صفی، عزیز، چکبست، شوق، جوش اور اثر نے وہ کمال دکھایا جس کا جواب نہیں -

رباعی - یہ مسلم ہے کہ رباعی فلسفیوں کی گود میں پلی اس وجہ سے اس میں لفظی حیثیت سے متانت - جزالت اور سنجیدگی ہے تو معنوی اعتبار سے بے ثباتی دنیا، فقر و استغنا، حقیقت و معرفت، پند و موعظت، تصوف و حکمت اس کا موضوع ہے - ایسی خشک باتیں شاعرانہ انداز میں لطف زبان اور زور بیان کے ساتھ دو شعروں میں اور خاص بحروں میں کہدینا آسان کام نہیں ہے - اس صنف کو لکھنؤ میں مرثیہ گویوں کی بدولت اتنا عروج ہوا کہ آج رباعیوں کا سرمایہ مقدار اور خوبی میں اتنا اور ایسا ہے کہ کسی صنف سے کم یا پست نہیں ہے -

سلام - سلام کے متعلق یہ دعویٰ کرنا تو مشکل ہے کہ یہ اُردو کی ایجاد ہے کیونکہ اس انداز کی نظمیں فارسی میں بھی ملتی ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اُردو میں اس صنف کو فارسی سے زیادہ ترقی ہوئی اور صرف اہلِ لکھنؤ کی کوشش سے -

نوحہ - جہاں تک معلوم ہے دوسرے اصناف سخن کی طرح نوحہ کی ابتدا بھی دکن میں ہوئی اور متین اس صنف کے مخصوص مرثیوں میں سمجھے جاتے ہیں - دہلی میں اس کا وجود بہت کم پایا جاتا ہے -

ریختی - ریختی دہلی کی ایجاد ہے لیکن ترقی ہوئی اس کو لکھنؤ میں چنانچہ میر یار علی جان اس میدان کے مشہور شہ سوار ہیں لیکن آج کا ذوق سلیم اس کو گوارا نہیں کرتا اس لئے متروک ہے -

واسوخت - واسوخت بھی لکھنؤ میں دہلی سے آئی مگر نوزائیدہ حالت میں یہاں پل کر جوان ہوئی، امانت اس کے مخصوص مربیوں میں سمجھے جاتے ہیں آج یہ چیز بھی سنجیدہ مذاق پر بوجھ معلوم ہوتی ہے اس لئے ریختی کی طرح یہ بھی متروک ہے -

ڈرامائی نظم - ڈرامائی نظم کی ایجاد خاص لکھنؤ میں ہوئی دہلی والے اس سے واقف نہیں - اب اعتراضات پر اسی ترتیب سے غور کرنا چاہئے آپ کو یاد دلا دوں پہلا اعتراض یہ تھا کہ لکھنؤ کی تہذیب میں زنانہ پن پیدا ہوگیا تھا اس لئے وہاں کی شاعری میں نسائیت غالب ہے -

اس کو ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ سپاہیانہ بانکپن لکھنؤ کے تمدن کا خاص جزو ہے لہذا اس اعتراض کی بنیاد ہی غلط ہو جاتی ہے - لیکن یہ دیکھنا ضروری ہے کہ معترض کو کون سی بات ایسی نظر آتی ہے جس کو وہ زنانہ پن سمجھتا ہے - اس کے سمجھنے میں

ہم کو وہ مثالیں زیادہ مدد دیں گی جن کو معترضین پیش کیا کرتے ہیں - یہ مثالیں دو طرح کی ہیں ایک تو چند محاورے ہیں جن کے استعمال کو وہ زنانہ پن کہتے ہیں - جیسے میں صدقے - میں قربان، مریجان، اے ہے، خدا کی مار، آنکھیں پھوٹیں، ہاتھ ٹوٹیں - دوسرے غزل میں معشوق کے زنانہ اوصاف ولوازم کا ذکر جیسے چہرہ کا نکھار، سینہ کا اُبھار، زلفوں کی درازی، محرم، کنگھی چوٹی، سُرمہ، مسّی -

پہلی قسم کی مثالوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان محاوروں میں ایسی نرمی اور نزاکت ہے کہ حباب کی طرح ہوا کی ٹھیس بھی نہیں سہہ سکتے - اسی نرمی اور نزاکت کو لوگ زنانہ پن سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ باتیں تہذیب و تمدن کی بلندی کو ظاہر کرتی ہیں - یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ تہذیب کیا ہے لہذا پہلے تہذیب کی تعریف سُن لیجئے - لغت میں خرمے کے درخت سے چھال کا ریشہ دور کرنے کو تہذیب کہتے ہیں اور اصطلاح میں ناتراشیدگی اور بھدّے پن کو دور کرنے کا نام تہذیب ہے - جس چیز سے جتنا بھونڈا پن دور ہوتا جائے گا اتنی ہی وہ چیز سبک اور نازک ہوتی جائے گی اور جب تہذیب اعلیٰ معیار پر پہونچ جاتی ہے تو اس میں انتہائی نزاکت آجاتی ہے - مولانا شبلی نے ایک عمدہ مثال سے اس کو سمجھایا ہے وہ کہتے ہیں کہ ابتدائے تہذیب میں لونگ کی خوشبو سے دماغ معطر کیا جاتا تھا لیکن جتنا تمدن ترقی کرتا گیا اتنی ہی ایسی خوشبوئیں دماغ میں جھنجھاہٹ پیدا کرنے لگیں اور بیلے چنبیلی کی بھینی بھینی خوشبو پسند کی جانے لگی - اسی سے ہر چیز پر قیاس کر لیجئے - مثلاً رفتار و گفتار میں تیزی و تندی کے بجائے سکون و وقار، نشست و برخواست میں سنجیدگی و متانت، لہجہ میں نرمی و نزاکت آجاتی ہے - جب دہلی میں سکون و اطمینان تھا اور تہذیب و تمدن کو ترقی تھی اس وقت دہلی کے آس پاس کے دیہاتی دہلی والوں کو بھی زنانہ کہتے تھے - انشاء اللہ خاں نے دریائے لطافت میں اس کو بیان کیا ہے :-

"اہل مغلپورہ و سادات بارہہ باوصف تولد در دہلی صاحب اردو نیستند - چرا کہ از زبان پدر و مادر و عم و خال و شوہر خالہ و شوہر عمہ وصف وطن شریف باشندگان آنجا در شجاعت و سخاوت و مسافر پروری و آقا پرستی و شناوری و بابرزگ در افتادن - و جاہلانہ و بے ادبانہ روبروے او حرف زدن و از فرط غرور شجاعت سخن کسے را گوش نہ کردن و متوجہ تصحیح الفاظ دگر دیدن و معترض را شمشیر نشان دادن و وضع عیاشان شہر را از قبیل آرایش بدن بر خمت باریک مشتمل بر گوٹہ و کناری مذموم پنداشتن و در بندش دستار و رفتار و گفتار پیروی اسلاف کردن و تقلید خوش لباسان پائے تخت را باعث انحراف از طریق نجابت انگاشتن می نمودند - و خود را در ہر چیز مشابہ بجد و پدر میخواہند و ازیں کہ کسے بگوید کہ فلانے در صحبت شاہجہاں بادیان حرف زدن و راہ رفتن و دست پیچیدن را ہر وضع بزرگان خود فراموش کردہ است و شما الحمد اللہ کہ یک لفظ ازیں شہر بر زبان ندارید بسیار خوشی می شوند ــــ و در آنجا اہل مغلپورہ کسانے کہ آبائے شان از لاہور و پشاور و کابل و غزنی و بلخ و بخارا و سمرقند برآمدہ اند و خود شان کابیشاوری کے بر سر گزاشتہ و یکچشم را بان پوشیدہ راہ روند و برادر را برادر صاحب و بھیا و بھائی جان گفتن عیب پنداشتہ از آنکا گفتن دست بر مدارند -

وصاحبان بارہ آدم شاہجہاں آبادی را بیوفا دنامرد دزنانہ پنداشتہ میران پورو مورنہ وکٹھور وجانسٹھ وگنگرولی وبڈولی را در پرگنہ آباد کنند دنان خمیری وزردک درگوشت گاؤ باسی بخورند وفریب دوصد حصہ برائے دیگر برادران فرستند ہر بخشش مشتمل بریک پیالہ بر از حال باش سیاہ عنبر منشر کہ یک من ہندی آں نیم سیر روغن داشتہ باشد بالحم البقر بہمین کیفیت و دو نان خمیری کہ نیم سیر وزن باشد وبعد تناول کردن طعام وشستن دست امیران دہلی را عیب کنند وبگویند کہ امرائے ہندوستان برنیم سیر پلاست، روپیہ صرف می نمایند وتنہا در خلوت یا بیگم یا خانم یا لولی زہر مار می کنند دیک دو لقمہ کہ از دست ایشان بیرون آید حق سارنگی نوازے یا قرم سلقے می شود برائے ہمیں ہندوستان خراب شد۔ ایسے کھاؤنے سے تو گو کھاؤنا بہتر ہے، قول سید صاحب در باب خرابی ہندوستان انچہ می فرمایند معروف بصدق است لیکن بے سلیقگی را سلیقہ نمی تواں ساخت۔"

مولانا شبلی لکھتے ہیں :

"جو ملک ایک مدت ناز و نعم میں پلا ہو وہاں کے لوگوں کے جسم میں نزاکت۔ حُسن اور لوچ ہوگا۔ اسی طرح ضرور ہے کہ انکے الفاظ میں لطافت نازکی اور شیرینی ہو۔"

اسی وقت ایک ایسی زبان بنتی ہے جو غزل کے لئے مناسب ہوتی ہے مولانا شبلی نے شعر العجم میں اس پر بہت اچھی طرح بحث کی ہے وہ کہتے ہیں :-

الفاظ متعدد قسم کے ہوتے ہیں بعض نازک۔ لطیف شستہ۔ رواں شیریں اور بعض پر شوکت متین۔ بلند۔ پہلی قسم کے الفاظ عشق و محبت کے مضامین ادا کرنے کے لئے موزوں ہیں۔ عشق و محبت انسان کے لطیف اور نازک جذبات ہیں اس لئے ان کے ادا کرنے کے لئے لفظ بھی اسی قسم کے ہونے چاہئے یہی بات ہے کہ قدماء کی بہ نسبت متاخرین کی غزل اچھی ہوتی ہے۔ متاخرین یعنی کلیم۔ صائب وغیرہ کی نسبت یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ قصیدہ اچھا نہیں کہتے تھے اس کا سبب یہ ہے کہ انکے زمانہ میں تمدن اور معاشرت میں نزاکت پرستی آگئی تھی اور عشقیہ جذبات عام ہو گئے تھے۔ اس کا اثر زبان پر بھی پڑا یعنی زبان زیادہ نازک اور لطیف ہو گئی جو غزل کے لئے موزوں تھی۔ شعر العجم صفحہ ۷۰ تا ۷۸

اگر غزل کو غزل کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس کی تعریف یہ ہے : "معشوق سے باتیں معشوق کی باتیں"

ظاہر ہے کہ معشوق سے باتوں میں انتہائی فتادگی۔ نیاز مندی اور نرمی کی ضرورت ہے اور معشوق کی باتیں کسی رزمیہ داستان کا بیان نہیں ہے۔ اس لئے اس میں بھی نرمی اور شیرینی ادا کی ضرورت ہے مولانا شبلی نے شعر العجم میں لکھا ہے کہ :-

"غزل کی ایک خاص زبان ہے جس میں نزاکت۔ لطافت اور لوچ ہوتا ہے۔ جلد ۵ صفحہ ۳۰

غزل کی زبان کے اس لوچ اور نزاکت کو جو لوگ سمجھ سکتے ہیں وہی اس سے لطف اُٹھا سکتے ہیں وہی اس سے لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ذیل کی مثالیں اس کو کچھ واضح کر سکیں، میر کا شعر ہے :

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اسی مضمون کو سودا نے یوں کہا ہے :

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

میر کے شعر میں جو نرمی اور نزاکت ہے اسی کو لوگ زنانہ پن کہتے ہیں جیسا کہ خود سودا نے میر کا یہ شعر سن کے کہا تھا کہ اس کی ماں نے کہا ہوگا۔ لیکن جو لوگ غزل کی اس خصوصیت سے واقف ہیں وہ اس چیز کو لطف زبان سمجھتے ہیں ایسی مثالوں سے دہلی والوں کا کلام بھی خالی نہیں ہے :

کہے ہے خنجر قاتل سے یہ گلو میرا کمی جو مجھ سے تو تو پئے لہو میرا ذوق

وہ میرا چھیڑنا آغاز اُلفت میں شکایت سے وہ رکھکر ہاتھ کانوں پر ترا کہنا کہ بھر پایا داغ

میں صدقے۔ میں قربان۔ مریجاں یہ سب فارسی محاوروں کے ترجمے ہیں ان کا لطف وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں جنکی زبان قند پارسی کی لذت سے آشنا ہے۔ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ میں صدقے میں زنانہ پن ہے اور قربانت شوم میں مردانہ پن اسی طرح "اے ہے" "جاؤ بھی" "خدا کی مار" ایسے محاورے میں جو دہلی والوں سے لکھنؤ والوں نے سیکھے ہیں اور دہلی میں آج بھی بولے جاتے ہیں۔ اور یہی دونوں مقام وہ ہیں جنھوں نے پہلے پہل زنانہ و مردانہ بولی میں فرق پیدا کیا اور آج تک یہ فرق موجود ہے۔ زنانے محاورے مرد اور مردانے محاورے عورتیں نہیں بولتیں۔ جب اہل زبان ایسے محاورے بولیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ محاورے زنانے نہیں ہیں، چنانچہ اس زمانہ کے مشہور انشا پرداز ماشاءاللہ خیری جو دہلی کے باشندے اور وہاں کی زبان لکھنے میں خاص شہرت رکھتے تھے اپنے ایک مضمون (چاندنی چوک کا جنازہ) میں دہلی کے دو شخصوں کی گفتگو لکھتے ہیں ایک میر صاحب ہیں دوسرے مرزا صاحب۔ مرزا صاحب دہلی کی پرانی چہل پہل کا ذکر کرتے ہیں تو میر صاحب کہتے ہیں :۔

اے ہے مرزا صاحب! کلیجہ پر سانپ لوٹ گیا شہر کی آباد کا سماں آنکھوں میں پھر رہا ہے کیا چہل پہل تھی ——————

خدا کی مار ایسی ترقی کو پھلے وا سے لالوں کو پریوش مہ جمالوں کو فاقوں میں تڑپتے دیکھا۔

ایسے محاورں سے زنانہ پن محسوس کرنا زبان سے ناواقفیت اور تہذیب و تمدن سے اجنبیت کی دلیل ہے۔ دوسری بات جو زنانہ کے ثبوت میں بڑی شد و مد سے پیش کی جاتی ہے یہ ہے کہ لکھنؤ والے معشوق حقیقی کے بجائے معشوق مجازی اور اس کے زنانہ خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں مثلاً :

کسی کی محرم آب رواں کی یاد آئی حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا

میری سمجھ میں یہ آنا مشکل ہے کہ عورت سے رغبت اور اس کے خصوصیات سے قلبی کشش ظاہر کرنا اگر زنانہ پن ہے تو مردانہ پن کیا ہے؟

اس زمانہ کے مشہور انشا پرداز حضرت نیاز فتحپوری نے غزل کی تعریف اور اسکے حدود یہ معین کئے ہیں :۔

لفظ غزل کے لغوی معنی اس قدر عام و مشہور ہو چکے ہیں کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں، جس نے محبت کی ہے اسے تو خیر جاننا ہی چاہئے لیکن جو اس کوچہ سے نابلد ہے اس کو بھی سماعی یا قیاسی طور پر معلوم ہوگا کہ محبوب سے باتیں کرنے کا نام غزل و تغزل ہے یا

مغازلہ اگر یہ گفتگو باہم گر ہو، اب غور طلب یہ امر ہے کہ محبوب سے ایک عاشق کیا باتیں کر سکتا ہے اور ان باتوں کا انداز و لب و لہجہ کیا ہونا چاہئے۔ محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے پھر اگر یہی جذبۂ پسندیدگی افراد نوع انسانی سے کسی کے ساتھ ہو تو وہ محبت کہلاتا ہے لیکن جس محبت کا تعلق غزل گوئی سے ہے وہ مخصوص ہے اس جذبہ سے جو جنسی کشش و خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ محبت ماں، بھائی اور اعزہ و احباب سے بھی ہوتی ہے لیکن ان میں سے کوئی غزل کا موضوع نہیں اس کا تعلق صرف ایسے فرد سے ہوتا ہے جس سے انسان میں جنسی ہیجان پیدا ہو سکتا ہے۔ بعض احباب کو میں نے کہتے ہوئے سنا ہے کہ علاوہ جنسی محبت کے ایک چیز ذہنی و روحانی محبت بھی ہے، لیکن میں اس کو محض شاعری سمجھتا ہوں اور اس کا وجود جنسی کیفیت سے علیحدہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تاہم اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ اس عنقا کا وجود ممکن ہے تو بھی اس کا غزل گوئی سے کوئی واسطہ نہیں۔

الغرض تغزل کا تعلق میرے نزدیک صرف ان جذبات محبت سے ہے جو اسی گوشت و پوست کی دنیا میں گوشت و پوست سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کے پورا کرنے کی تمنا ہر محبت کرنے والے کو ہوتی ہے۔" (انتقادیات حصۂ دوم صفحہ ۱۶۱ تا ۱۶۳)

اس تعریف کو پیش نظر رکھنے کے بعد عورت کو معشوق قرار دینا اور اس کے عشق کی داستان بیان کرنا ہی غزل ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھئے کہ عورت سے محبت کا اظہار اُردو شاعری میں عیب نہیں نہ اس پر کسی کو اعتراض ہے۔ مثنوی کا وجود اس کا زندہ گواہ ہے۔ جب یہ چیز سوسائٹی میں عیب بلکہ ایک صنف کی جان ہے تو غزل جس کو اب اتنی وسعت حاصل ہو چکی ہے کہ دنیا بھر کی باتیں اس کا موضوع بن چکی ہیں سائنس دقایق۔ فلسفہ کے حقایق۔ تصوف کے وسائل۔ حکمت کے مسائل۔ وطن۔ قوم۔ مذہب سیاست۔ اقتصادیات غرض، وہ کونسی بات ہے جو غزل کا موضوع نہ ہو تو پھر عورت نے کیا قصور کیا ہے؟۔ اب رہے اسکے اوصاف تو اگر ان میں ہاتھ نہ لگایا جائے تو عشقیہ شاعری کا وجود نہ رہ جائے۔ اس لئے کہ اگر خال مشکیں اور زلف دراز کا ذکر نہ کیا جائے تو غمزہ و ناز کا ذکر کیوں کیا جائے اور جب اس کو بھی چھوڑ دیا جائے تو پھر وہی سبزۂ خط باقی رہ جاتا ہے جو دہلی کی شاعری کا مابہ الامتیاز ہے۔ اور چونکہ لکھنؤ میں عورتوں سے محبت کی جاتی تھی اور امارد سے دلچسپی یہاں کی سوسائٹی میں عیب تھی اس سبزہ کو یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آسکتی تھی لازماً زنانہ اوصاف کا ذکر کیا جاتا جبکہ متقدمین دہلی کے یہاں بھی یہ شراب کھنچ چکی ہے تو اگر لکھنؤ والوں نے دو آتشہ کر دیا تو کیا گناہ ہوا؟

دوسرا اعتراض - دوسرا اعتراض لکھنؤ کی شاعری پر ایہام گوئی ہے۔ اس کو لکھنؤ سے مخصوص بتانا بھی ایک کھلی ہوئی زبردستی ہے۔ دہلی کی شاعری کا پہلا دور ایہام گوئی ہے۔ مصحفی لکھتے ہیں:-

"در ابتدائے شوق کہ ہنوز میر و میرزا کسے در عرصہ وجود نیامدہ بود دور دور ایہام گویاں بود"

میر حسن اپنے تذکرہ میں محمد شاکر ناجی کے متعلق لکھتے ہیں:-

تلاش صنف ایہام بسیار داشت

مصنف گل رعنا کا بیان ہے :-

"ایہام گوئی قدما کی شاعری مایۂ ناز ہے"

شاہ مبارک آبرو کے حالات میں لکھتے ہیں :-

"اس زمانہ کے دستور کے موافق تشبیہ اور ایہام میں کلام اُلجھا ہوا ہے"

ان شہادتوں اور خود ان لوگوں کے کلام سے یہ حقیقت مسلم ہے کہ دہلی کی شاعری کا ابتدائی دور ایہام گوئی ہے اس کو لکھنؤ سے مخصوص بتانا کسی طرح درست نہیں - لیکن یہ ستم ظریفی بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ لکھنؤ میں ناسخ و آتش کے شاگردوں کے بعد صنعتوں کا بازار سرد ہو گیا لیکن اس کو لکھنؤ کی جدید شاعری نہیں کہا جاتا بلکہ دہلی کی شاعری کی تقلید کہا جاتا ہے اگر یہ صحیح ہو تو ایہام گوئی کے دور کو بھی دہلی کی قدیم شاعری کی تقلید کہنا چاہئے - ایہام گوئی کوئی بری بات نہیں جس کا طعنہ لکھنؤ والوں کو دیا جاتا ہے بلکہ یہ بھی فن کاری ہے اس سے شعر میں حسن پیدا ہو جاتا ہے - بے شک اس کا بے ڈھنگا استعمال شعر کو گورکھ دھندا بنا دیتا ہے - شعرائے لکھنؤ نے صنعتوں کے استعمال میں جو کمال دکھایا ہے اس کی مثال دہلی تو کیا شاید دنیا میں کہیں نہ مل سکے اور چونکہ اس کا استعمال کثرت سے ہوا ہے کہیں کہیں بے ڈھنگا پن بھی پیدا ہو گیا ہے - معترضین اچھے نمونے چھپا کے بُرے سے بُرا شعر ڈھونڈھ کے نکالتے ہیں اور اس کو لکھنؤ کی شاعری بنا کے پیش کرتے ہیں حالانکہ کمال کی سند بہترین اشعار ہوتے ہیں - دہلی کی شاعری کا جو مخصوص رنگ کہا جاتا ہے اس کے بدترین نمونے خود دہلی والوں کے کلام میں موجود ہیں میر ایسے خدائے سخن کے متعلق "بلندش بغایت بلند و پستش بغایت پست" مشہور ہے تو کیا ان کا وہی "بغایت پست" کلام سامنے رکھ کر ان کی ذوق شاعری پر حکم لگایا جاتا ہے

محمد باقر شمس

بیرون کا آخری علاج

ہر روز بخار - کھانسی - سینہ کا درد رہنا اعضاء وغیرہ دفعہ ہو جانا ہے اور وہ بخار ہر پندرہویں سے اندر ایت کر جاتا ہے اس کو لکھنؤ کے ڈاکٹر بخار کو دور کرتی ہے خون میں سرخی بڑھتی ہے اور جسم اور چہرہ میں پھر اردو ہو جاتا ہے اور وہ انتہائی کمزوری جو بخار وغیرہ رہنے سے ہو جاتی ہے بالکل مفقود ہو جاتی ہے یہ دوا نہایت قیمتی اجزاء سے بنائی گئی ہے آپ کیوں اس مرض میں مبتلا ہو کر موت کے شکنجہ میں جانے ہیں آخری علاج اس دوا کو استعمال کیجئے سو میں سو مریضوں پر کامیاب ہے دو پیہ کا لوجہ نہیں کیجئے یہ دوا جب کامیاب مریضوں پر کامیاب ہو چکی ہے پھر خدا نے میں کیا دیر ہے فوراً آرڈر دیجئے - قیمت چھ روپیہ آٹھ آنے (رجسٹری)

(نوٹ) فائدہ نہ ہونے کی صورت میں قیمت واپس - جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے میرا یہ نسخہ علاج خدا کے فضل سے کئی ہزار مریضوں پر کامیاب ہو چکا ہے اگر آپ کو فائدہ نہیں ہوتا تو خدا کے واسطے مجھ کو بدنام نہ کیجئے کیونکہ یہ نسخہ میری ۹ سالہ محنت کا نتیجہ ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس نسخہ سے بہت سے مریض شفا یاب ہو چکے ہیں

پتہ: حکیم نبی بخش صاحب - لکھنؤ - (یو - پی)

محمود لکھنؤ

خاموش آواز

جس چیز کو ہم آواز کہتے ہیں، اس کا وجود علٰحدہ کوئی نہیں ہے، بلکہ آواز نام ہے صرف ہمارے سننے کا، چنانچہ اگر دور سمندر کے کسی ویران جزیرہ میں بم پھٹنے کا دھماکا ہو، اور اس کا کوئی سننے والا نہ ہو تو آواز وجود میں نہ آئے گی۔ آواز کی حقیقت صرف یہ ہے کہ دو میکانکی چیزوں کے تصادم سے ایتھر میں جو لہریں پیدا ہوتی ہیں وہ ہمارے کان کے پردے سے ٹکراتی ہیں اور ہم اسے آواز کی صورت میں محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اگر یہ لہریں اتنی تیز ہوں کہ ہمارے کان کا پردہ ان کا ساتھ نہ دے سکے تو ہم اسے نہ سن سکیں گے اور اسی کا نام علماء نے "خاموش آواز" رکھا ہے اور جس کے متعلق بعض عجیب انکشافات ہوئے ہیں۔

دنیائے سائنس اور صنعت و ڈاکٹری میں اس کو اتنی اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ درجنوں کارخانوں میں اب اس سے کام لیا جا رہا ہے۔ اس کام کی تفصیل بھی سن لیجئے۔

جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ میکانکی لہروں کا نام آواز ہے اور اگر یہ لہریں سولہ ہزار سکنڈ کی رفتار سے پیدا ہوں تو بھی انسان انھیں نہیں سن سکتا، لیکن اب ان لہروں کی رفتار برقی آلات کے ذریعہ سے فی سکنڈ ایک کرور ۲۰ لاکھ تک بڑھا دی گئی ہے اور ان نہ سنی جانے والی آواز سے عجیب و غریب کام لئے جا رہے ہیں۔

لوہے کے کارخانوں میں سب سے زیادہ احتیاط اس بات کی کی جاتی ہے کہ لوہے کی جو چیز ڈھالی جائے وہ بالکل ٹھوس ہو اور اس کے اندر سوئی کی نوک کے برابر بھی کوئی خلا، یا کھوکھلا پن باقی نہ رہے ورنہ وہیں سے وہ ٹوٹ جائے گی۔ اب فرض کیجئے کہ لوہے کی کوئی چیز، اگر موٹی ڈھالی گئی ہے تو اس کے اندر کا حال کیونکر معلوم ہو سکتا ہے۔ اس سے قبل اس باب میں بڑا تردد کرنا پڑتا تھا، لیکن اب خاموش آواز کی مدد سے آناً فاناً اس نقص کا پتہ چل سکتا ہے۔

مچگن یونیورسٹی کے ڈاکٹر فلائیڈ فائر اسٹون نے جب اتنے وزنی ڈھلے ہوئے لوہے میں یہ خاموش آواز ایک سرے سے منتقل کی تو دوسرے سرے سے جھنجھناہٹ سی پیدا ہونے لگی جو علامت تھی اس بات کی کہ اندر نقص موجود ہے۔ اس طریقہ سے نہ صرف یقینی طور پر نقص کا پتہ چل جاتا ہے بلکہ یہ بھی کہ نقص کس جگہ ہے اور کس قسم کا، چنانچہ اب انجنوں اور مشینوں کے تمام بھاری پرزوں کی جانچ اسی طرح کی جاتی ہے۔

دودھ کے کارخانوں میں اس سے جو کام لیا جاتا ہے وہ اس سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ دودھ کو لوہے کی چادروں پر بہایا جاتا ہے اور ان چادروں پر خاموش آواز کی لہریں ڈالی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دودھ کے اندر کے تمام

خراب جراثیم ہلاک ہوجاتے ہیں ——— اسی طرح کھانے کی دوسری چیزوں کے جراثیم بھی اس سے دور کئے جاتے ہیں اور چہرہ پر لگانے کے پوڈر اور غازہ کو بھی صاف کیا جاتا ہے۔

کنساس میں ایک موٹر کے کارخانہ دار نے اس سے بہت عجیب و غریب کام لیا ہے۔ موٹروں میں اس نے ایک خاموش آواز پیدا کرنے والا آلہ لگا دیا ہے اور جب کوئی موٹر گراج کے قریب پہونچتا ہے تو اس آلہ کا بٹن دبا دیا جاتا ہے جس سے ایک خاموش سیٹی کی آواز پیدا ہوتی ہے جسے گراج کا مائکروفون پکڑ لیتا ہے اور اس موٹر کو چلا دیتا ہے جس سے گراج میں روشنی بھی ہوجاتی ہے اور اس کا دروازہ بھی از خود کھل جاتا ہے —— کیمبرج کے بحری بیڑے میں بھی اس آواز کا تجربہ ہو رہا ہے اور کُہر کو اس کے ذریعہ سے بہ آسانی دور کیا جاسکتا ہے —— روس کے بعض ماہرین نے اس کا تجربہ بیجوں پر کیا تو معلوم ہوا کہ جن بیجوں پر اس آواز کی لہریں ڈالی جاتی ہیں ان کی پیداوار بڑھ جاتی ہے، چنانچہ آلوؤں اور مٹر پر تجربہ کرنے سے آلو کی پیداوار ۵۰ فی صدی تک پیداوار بڑھ گئی اور مٹر کی تگنی —— کپڑے دھونے اور صاف کرنے میں بھی اس سے کام لیا جاتا ہے، اور وہ اس طرح کہ اس کی لہریں میل اور خاک کے باریک سے باریک ذرہ کو بھی باقی نہیں رہنے دیتیں، چنانچہ شکاگو میں ایک موجد نے ایک استری اس قسم کی ٹینیٹ کرائی ہے جس کو قالینوں وغیرہ پر پھرانے سے تمام خاک دور ہو جاتی ہے —— ایک کمپنی نے حال ہی میں ایک آلہ ایجاد کیا ہے جس سے ۲ لاکھ فی سکنڈ کی رفتار سے لہریں پیدا ہوتی ہیں اور سیکڑوں فیٹ دور تک اپنا کام کرتی ہیں۔ کارخانوں میں دھوئیں اور بھاپ سے اکثر لوگ بیمار ہوجاتے ہیں، لیکن اب اس کے ذریعہ سے یہ مصیبت بھی دور ہو جائے گی، کیونکہ اس کی لہریں فضا میں پھیلے ہوئے کوئلہ کے ذرات کو ایک جگہ مجتمع کرکے گولیوں کی شکل میں زمین پر گرا دیں گی۔

شراب وہی عمدہ سمجھی جاتی ہے جو بہت پرانی ہو اور اس لئے سالہا سال تک اسے تہ خانوں میں رکھ کر بازار میں لایا جاتا ہے۔ لیکن خاموش آواز کی لہریں اس زحمت کو بھی دور کر دیں گی، کیونکہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ تازہ شراب ان لہروں کے اثر سے اثر و مزہ میں پرانی شراب کی طرح ہو جاتی ہے —— پچھلی جنگ میں آواز سے ہلاکت پھیلانے کی کوشش کی گئی تھی اور ایک صوتی بندوق طیار کی گئی تھی جس سے نہایت کرخت آواز پیدا ہوتی تھی اور اندازہ کیا گیا تھا کہ اس آواز سے ۶۰ میٹر کے فاصلہ پر ایک انسان ۳۰ سکنڈ کے اندر ہلاک ہو سکتا ہے، اور ۳۰۰ میٹر کے فاصلہ پر بیکار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اب کوشش ہو رہی ہے کہ آیندہ جنگ میں خاموش آواز سے بھی مہلک اسلحہ کا کام لیا جائے۔

طبی دنیا میں بھی اس آواز کی لہروں سے کام لیا جا رہا ہے، چنانچہ کولمبیا یونیورسٹی میں ۳۷ بلیوں، کتوں اور بندروں کے دماغ کا آپریشن بغیر جراحی کے محض اس آواز کی لہروں سے کیا گیا۔

الغرض "خاموش آواز" تجربات سے بڑے کام کی چیز معلوم ہوئی ہے اور وہ زمانہ دور نہیں جب بجلی کی جگہ بہت سے کام اس سے لئے جائیں گے۔

مُنیر شکوہ آبادی

مرا کلام ہو مقبول اہلِ دل یارب ترے کرم سے بس اتنا امیدوار ہوں میں

منیر کی زندگی میں ان کے کلام کی شہرت و مقبولیت کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ منیر کی یہ دعا واقعی قبول ہوگئی، جہاں گئے ان کی پذیرائی ہوئی، جس محفل میں پہونچے، لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور گو زمانہ کی پر آشوبی نے انھیں در بدر بھٹکایا، لیکن ہر جگہ اس شاعری نے ان کی امداد کی۔ اسی کی بدولت انھیں شہرت، عزت اور نوابوں اور رئیسوں کی مصاحبت حاصل ہوئی اور اسی لئے انھیں امید تھی کہ ان کے بعد بھی ان کی شاعری کے چرچے رہیں گے، چنانچہ فرماتے ہیں :

باغِ جہاں میں جب تک رنگِ سخن ہے باقی باتیں ہماری ہوں گی لیکن ہمیں نہ ہوں گے

لیکن آج منیر باقی ہیں، اور نہ ان کی شاعری۔ عوام ان کے نام سے بھی ناواقف ہیں۔ خواص کے نزدیک ان کی شاعری کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

منیر کا اصل نام سید اسمٰعیل حسین تھا۔ آپ کے والد سید احمد حسین بھی شاعر تھے۔ شاد تخلص تھا اور سودا سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ منیر کی پیدائش شکوہ آباد ضلع مین پوری میں ہوئی، سن پیدائش کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض تذکروں میں ۱۲۳۱ھ اور بعض میں ۱۲۳۴ھ ملتا ہے لیکن منیر نے اپنے دیوان منتخب اللغات کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ دیوان انھوں نے پینتیس سال کی عمر میں پورا کرلیا تھا۔ منتخب اللغات ۱۲۶۴ھ میں مرتب ہوا۔ اس لحاظ سے ان کا سن پیدائش ۱۲۲۹ھ قرار پاتا ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ فارسی اور عربی کی تعلیم اپنے والد سے اور دینیات کی تعلیم اپنے بڑے بھائی سے حاصل کی۔

منیر نے جب ہوش سنبھالا تو شراب سخن کا دور اپنے ہی گھر میں چلتا ہوا دیکھا بھلا وہ خود کیوں اس کی لذت سے محروم رہتے۔ منیر نے لکھا ہے کہ وہ بچپن ہی سے اس لیلائے سخن پر فریفتہ ہوگئے اور شب و روز اسی خیال میں غرق رہنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی ان کے کمال فن نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ آگرہ کے ایک مشاعرہ میں نواب نظام الدولہ کی ایک غزل سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھیں اپنے ساتھ لکھنؤ لے گئے اور وہاں انھیں ناسخ کا شاگرد کرادیا۔ غازی الدین حیدر کی مسند نشینی پر جب ناسخ کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا تو انھیں کے اشارے سے منیر، اوسط علی رشک سے اصلاح لینے لگے۔ منیر نے جابجا اپنے اشعار میں ان دونوں حضرات کے کمال فن اور اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے:

رشک کے فیض تلمذ سے منیر شاعروں میں تو بھی یکتا ہوگیا

حضرت ناسخ کی اصلاح اس غزل پر ہے منیر — آج رتبہ تیری فکر پست کا بالا ہوا،

ایک اور غزل میں جس کی ردیف "جناب رشک" ہے، انھوں نے رشک اور ناسخ دونوں پر عقیدت کے پھول چڑھائے ہیں

یکتائے عصر و عالم فاضل جناب رشک — علامہ و محقق کامل جناب رشک
استاد شاعران جہاں سید جلیل — محتاط و عابد و متوکل جناب رشک
اُردو لغات، قاعدۂ فن شاعری — طے کر چکے تمام منازل جناب رشک
دیوان تینوں مصحف اعجاز نظم ہیں، — رد کر چکے ہیں جادوئے بابل جنابِ رشک
سوئے بہشت حضرت ناسخ رواں ہوئے — جب ہو چکے افادہ کے قابل جنابِ رشک
ناسخ تھے آفتاب سپہرِ کمال کے — برجِ علوم کے مہِ کامل جنابِ رشک
کیونکر نہ میری قدر زیادہ ہو اے منیر — سمجھا گئے تمام مسایل جنابِ رشک

اپنے اُستاد رشک کے ساتھ انھوں نے کلکتہ، مرشد آباد، کانپور، الہ آباد وغیرہ کی سیر کی اور اپنی ملازمتوں کے سلسلہ میں بھی انھیں فرخ آباد، کانپور اور باندہ وغیرہ میں رہنا پڑا لیکن ان کا دل ہمیشہ لکھنؤ میں رہا۔ وہ لکھنؤ کے عاشقوں میں تھے۔ اور اس بلدۂ حسن کی گوناگوں دلچسپیوں کے مقابلہ میں دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت کو ہیچ سمجھتے تھے۔ لکھنؤ کو چھوڑنا ان کے لئے کسی محبوب سے بچھڑنا تھا لیکن معاش کی خاطر انھیں بار بار لکھنؤ کو خیرباد کہنا پڑتا اور باہر جا کر جب خوش حالی سے گزرنے لگتی تو لکھنؤ انھیں پھر یاد آنے لگتا۔ غرضکہ ان کی ساری عمر اسی غم دوراں اور غم جاناں کے چکر میں گزری۔ نواب تجمل حسین خاں کے طلب کرنے پر لکھنؤ چھوڑنے کے متعلق اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں: "ناگزیر داغ مفارقتِ شہرے ہمچو لکھنؤ بر دل نہادہ، بمعمورۂ فرخ آباد پائے خاکی کردم"۔ اور اسی طرح ایک دفعہ جب تمام دنیا میں ان کے لئے کہیں ٹھکانہ نہ رہا تو لکھنؤ آتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"آخر بحوادث گوناگوں مبتلا گردیدہ، بہ بیت السلطنت لکھنؤ شتافتم و بقول فخر المتاخرین مولانا غالب دہلوی ؎

اندر آں بقعۂ معمور ز دلتنگی خویش — حسرت آگیں چو گنہگار بہ زنداں رفتم"

ان کے دیباچہ سے اور بھی کئی مقامات پر لکھنؤ سے ان کی محبت ہویدا ہوتی ہے اور اپنے اشعار میں تو جا بجا انھوں نے لکھنؤ سے اپنی والہانہ شیفتگی کا مظاہرہ کیا ہے:

لکھنؤ مجھ سے چھڑایا میری قسمت نے منیر — کر دیا بلبلِ شیدا کو چمن سے باہر
غم خانہ کانپور اگر ہے تو ہو منیر — صد شکر لکھنؤ تو ہے دولت برائے عیش
منیر، لکھنؤ میں چل کے دیکھو قیصر باغ — ہوائے گلشنِ جنت اگر دماغ میں ہے،
لکھنؤ کی آب و گل میں جان دیتا ہے منیر، — سلطنت کا بھی زمانے میں تمنائی نہیں،
چلا ہوں لکھنؤ سے ہے منیر یہ تاریخ — بہشت ہند سے افسوس ہائے میں نکلا،

جیسا کہ ابتدا میں ذکر ہوا منیر کو تمام عمر کسی نہ کسی رئیس یا نواب کی مصاحبت حاصل رہی۔ نواب نظام الدولہ کے ساتھ آگرہ سے لکھنؤ پہونچے، انھیں کی سفارش پر ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ اس کے بعد نواب علی اصغر خاں نے اپنی مصاحبت میں رکھ لیا۔ ابھی اطمینان نصیب ہوا ہی تھا کہ پھر تیرہ بختی نے آگھیرا۔ مولانا احمد حسن خاں بہادر عروج نے قدر دانی سے کام لیا، پھر سید محمد ذکی خاں بہادر نے اپنے یہاں طلب کر لیا اور اپنا کلام انھیں دکھانے لگے۔ دو سال نواب صاحب کے ساتھ لکھنؤ کی رنگ رلیوں میں گزرے۔ اسی دوران میں نواب تجمل حسین خاں بہادر ظفر جنگ معروف بہ حشمت جنگ کے بلانے پر انھیں بہشت ہند سے نکلنا پڑا۔ منیر نے ایک قطعہ میں لکھنؤ کی جدائی اور نواب صاحب کی قدر دانی کا ذکر کیا ہے :-

امیر عہد تجمل حسین خاں نواب[1] — خطاب جن کا ظفر جنگ نام ہے اعلیٰ
زمانہ میں انھیں کہتے ہیں لوگ حشمت جنگ — مہ سپہر کرم فیض و علم میں یکتا
انھوں نے شفقہ مع زاد راہ بھیجا ہے — طلب کیا ہے کمال اشتیاق سے بخدا
چلا ہوں لکھنؤ سے سوئے فرخ آباد آج — ہزاروں حسرتیں، رنج و ملال ہیں صدہا

چلا ہوں لکھنؤ سے ہے منیر یہ تاریخ
بہشت ہند سے افسوس ہائے میں نکلا
۱۲۶۰ھ

فرخ آباد میں منیر کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور یہاں مادھو رام جوہر اور نواب واجد علی خاں رضوان وغیرہ آپ کے شاگرد ہو گئے اس کے بعد نواب تجمل حسین خاں کی ملازمت چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے، انھیں بیکار دیکھ کر راجہ الور نے سفر خرچ بھیج کر طلب کیا لیکن منیر نے جانے سے انکار کر دیا۔ منشی مادھو رام جوہر نے اس دوران میں کافی لطف و کرم کا اظہار کیا۔ اس کے بعد نواب علی بہادر والیٔ ریاست باندہ نے انھیں دو سو روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا اور اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ ریاست باندہ میں منیر نے کافی عرصہ تک قیام کیا اور یہ دور ان کی زندگی میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں ان کی زندگی کے آٹھ سات سال بڑے آرام و سکون اور بڑی عزت و توقیر کے ساتھ گزرے یہیں ان کے دونوں دواوین منتخب اللعالم اور تنویر الاشعار مرتب ہوئے اور یہیں سے ان کی زندگی میں قید و بند کا آغاز ہوا۔ نواب علی بہادر خاں ۱۲۶۵ھ میں مسند نشین ہوئے۔ منیر نے ایک قطعہ لکھ کر پیش کیا :

علی بہادر عالم پناہ بندہ نواز[2] — نہاد چوں بسر خویش افسر شوکت
منیر مصرع تاریخ ایں عمل گفت — جلوس باد مبارک بہ مسند نصرت
۱۲۶۵ھ

---

[1] یہ وہی تجمل حسین خاں ہیں جن کے لئے غالب نے کہا ہے : دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے — بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے
مفتی انتظام اللہ شہابی نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ جلاوطن ہوئے اور مکہ میں انتقال کیا۔ یہ صحیح نہیں کیونکہ ۱۸۴۶ء میں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ واقعہ ان کے بھائی تفضل حسین خاں کا ہے۔

[2] یہ اور اس کے بعد کے چند قطعات رسالہ مصنف جلد ۵ سے لئے گئے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نواب صاحب ایک دن سیر کو جاتے ہوئے منیر کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے، چہل قدمی کرتے ہوئے انھوں نے منیر کو چنبیلی کا پھول عنایت کیا، اس پر منیر نے فی البدیہ تاریخ پیش کی۔

صبح آئے حضور میرے پاس، نورِ حق کا ہوا فلک سے نزول
لے گئے اپنے ساتھ باغ پر ہو گیا مطلب عظیم حصول
پھر ہوا کھانے میں ہوئے مصروف جس طرح تھا ہمیشہ کا معمول
پھر دکھائی گلاب باغ کی سیر گل جنت سے بھی سوا ہر پھول
گلِ تازہ دیا منیر مجھے ہو گئی باغ باغ جان ملول

میں نے برجستہ یہ کہی تاریخ
گلِ خورشید ہے اجی یہ پھول

نواب صاحب، منیر کی اس برجستگی اور زود گوئی سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے ساتھ اور بھی زیادہ عنایات پیش آنے لگے ۱۲۶۷ھ
منیر نے اپنی شعر و شاعری اور دلچسپ علمی گفتگو سے نواب کو اس درجہ اپنا گرویدہ کر لیا تھا کہ وہ ہر معاملہ میں منیر سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتے تھے حتیٰ کہ ریاست کے انتظامی امور میں بھی انھیں دخل حاصل تھا۔ ۱۸۵۷ء میں جذبۂ آزادی نے ہر سینہ کو شعلہ زار بنا کر ہندوستان کو کوہ آتش فشاں میں تبدیل کر دیا، آزادی کے پروانے دہلی اور بادشاہ دہلی پر نثار ہونے لگے اور فرخ آباد۔ لکھنؤ۔ بہادر گڈھ۔ بلب گڈھ اور دوجانہ وغیرہ کے فرمانروا انگریزوں کے خلاف میدان میں صف آرا ہو گئے اور جب جھانسی کی رانی کے دلیرانہ کارناموں نے ہر متنفس میں روح آزادی پھونک کر انگریزوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تو نواب علی بہادر خاں کو بھی جس کے قرب و جوار میں رانی کے جنگی ترانے گونج رہے تھے، غیر جانبدار رہنا مشکل ہو گیا۔ انھوں نے منیر اور اپنے وزیر ولایت حسین سے مشورہ کیا، دونوں نے نبرد آزمائی کی ترغیب دی۔ چنانچہ فوجوں کو تیار کر کے نواب نے راج گڈھ کے قلعہ پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا، منیر نے فتح کی خوشی میں تاریخ کہی:

چو فوج بندیلہ بہ بانده رسید زحصن اجے گڈھ برائے فساد
بر ایشاں ظفر یافت نواب ما دل اہل انصاف گردید شاد
چنیں گفت تاریخ نصرت منیر خدا فتح عالی بہ نواب داد

۱۲۷۴ھ
فتح دی اپنی عنایت سے خدا نے آپ کو سب عدو مقتول تیغ و بستۂ زنجیر ہیں
آیۂ انا فتحنا مژدۂ فتح قریب تہنیت سے ہمزباں در دولت تقریر ہیں
فتح زیبا و مبارک ہو، مٹا غارِ خلش آپ منظور نگاہ مالکِ تقدیر ہیں

۱۵ جون ۵۷ء کو ایم، اے، کاک ویل گرفتار ہو کر نواب کے سامنے پیش کیا گیا، منیر نے ایک قطعہ کہا جس کا سب سے مشہور

شعر یہ ہے :

ہوا محبوس دو اباندہ میں آکر اجے گڈھ سے پھنسا دام مصیبت میں سیانا گرچہ کوّا ہے

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے آیا منیر کے دل میں بھی جذبۂ آزادی موجود تھا اور انھیں انگریزوں سے واقعی نفرت تھی اور اگر جواب اثبات میں ہے تو انھوں نے ان معمولی قطعات پر کیوں اکتفا کی۔ کیوں نہ ایسی ولولہ انگیز نظمیں لکھیں جو جوانوں کے دلوں کو گرما کر ان میں جام شہادت پینے یا انگریزوں کو نکال کر دم لینے کا جذبہ پیدا کر دیتیں۔ جہاں تک غم و غصہ کا تعلق ہے، انگریزوں کے خلاف غصہ اور نفرت سے ہر ہندستانی کا قلب معمور تھا گو زبان پر مہر خاموشی ثبت تھی اور پھر منیر کو تو لکھنؤ سے بے انتہا محبت اور واجد علی شاہ سے بڑی عقیدت تھی۔ ناممکن ہے کہ واجد علی شاہ کی معزولی پر وہ خون کے گھونٹ پیکر نہ رہ گئے ہوں اور اسی لئے ۵۷ء میں موقع ملنے پر انھوں نے نواب علی بہادر خاں کو انگریزوں سے انتقام لینے پر آمادہ کر دیا۔ رہا جوش پر اور ولولہ انگیز نظمیں کہنے کا سوال، یہ اس زمانہ کا رجحان ہی نہ تھا۔ دلوں میں کیسی ہی تیز آتش کیوں نہ بھڑک رہی ہو، مارنے اور مر مٹنے کا جذبہ کیسا ہی شدید کیوں نہ ہو، دشمن کے جور و ستم کے خلاف کتنی ہی نفرت اور آزادیِ وطن کے لئے کیسی ہی سچی لگن کیوں نہ ہو، لیکن ان کے یہ جذبات کبھی نظم کی صورت اختیار نہ کرتے تھے۔ غالب نرے انگریز پرست نہ تھے اور اگر کسی کو اسی پر اصرار ہو تو بھی ان کے حساس ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ غدر کے زمانے میں ان کے سیکڑوں عزیز دوست کام آئے بیسیوں رؤسا نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے، دہلی میں اونچی اونچی عمارتوں کی جگہ ویران کھنڈر نظر آنے لگے، خود غالب کو فقر و فاقہ کی مصیبتوں سے گزرنا پڑا۔ جیسا کہ غالب کے خطوط سے پتہ چلتا ہے، دہلی کی بربادی، دوستوں اور عزیزوں کی تباہ حالی اور فوجی گوروں کے ظلم و تشدد نے ان کے دل کو چھلنی چھلنی کر دیا تھا لیکن ان کا تمام کلام پڑھ جایئے آپ کو نام کو بھی کوئی نظم نہ ملے گی جس میں انقلاب کی ہلکی سی بو بھی آتی ہو۔ غالب اپنے ماحول سے بیزار نہ ہوں یا انھیں آخری مغلیہ حکمراں کی بے بسی کا صدمہ نہ ہو، یہ بات نہ تھی۔ انھوں نے اس کی طرف بعض جگہ اشارہ بھی کیا ہے لیکن اس پر تشبیہات و استعارات کے اس قدر تہ بہ تہ پردے پڑے ہوئے ہوں کہ آسانی سے ان پر ہماری نظر بھی نہ پڑتی۔ غالب کے "صریرِ خامہ" کی نوا "نوائے سروش" نہ تھی، نوائے خروش تھی۔ اپنے زمانہ کی تباہ حالی اور ویرانی کا مرثیہ تھی لیکن اس قطعہ کی آبیاری انھوں نے اپنے کس قدر خون سے کی ہے، آج کتنے اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اور "داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی شمع کی خموشی (بہادر شاہ ظفر کی بے بسی) پر انھیں کس قدر حزن و ملال تھا، یہ آج کون سمجھ سکتا ہے۔ ہاں تو یہ عرض کرنا ہے کہ اس زمانہ کے شعراء کو جذبۂ آزادی سے معرا سمجھنا بالکل خلاف عقل بات ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس زمانہ میں رزمیہ یا انقلابی نظمیں لکھنے کا رواج نہ تھا، اپنے دل کا مطلب استعارے میں چھپا جانے کا دستور تھا۔ اس لئے منیر سے باغیانہ نظمیں لکھنے کی توقع کرنا عبث ہے۔ انکا ہندستانی فوج کی فتحیابی پر اپنے قطعات میں خوشی کا اظہار کرنا ہی سب کچھ ہے۔

۲۰ر اپریل ۱۸۵۸ء کو جب باندہ انگریزوں کے زیر نگیں آگیا تو نواب نے بھاگ کر کہیں پناہ لی اور ولایت حسین اور

منیر، فرخ آباد سے امداد حاصل کرنے کے لئے روانہ ہوئے لیکن راستہ میں ہی انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ منیر کی جنگ میں شرکت اور ان کے قطعات کی موجودگی ہی انھیں دار و رسن کا سزاوار بنانے کے لئے کافی تھی۔ لیکن سوئے اتفاق انگریزوں کو ایک اور بہانہ ہاتھ آگیا۔ منیر کے دوستوں میں کوئی صاحب مصطفےٰ بیگ بھی تھے۔ انھوں نے ایک طوائف مسمی نواب جان کو قتل کر دیا۔ سرکار نے مصطفےٰ بیگ کو شاہی گواہ بنا کر منیر کو پھانس لیا اور انھیں سات سال کے لئے انڈمان بھیجد یا گیا۔ منیر نے اپنے ایک قطعہ میں ان تمام واقعات پر روشنی ڈالی ہے:

مصطفےٰ بیگ ایک صاحب ان میں ہیں — کج روؤں میں بڑھ کے چرخ پیر سے
کر کے خونِ ناحق نواب جان — مجھ کو بھی پھنسوا دیا تزویر سے
خون میرا وہ سمجھتے تھے حلال — تھا جو میں ذریتِ شبیر سے
فرخ آباد اور یارانِ شفیق — چھٹ گئے سب گردشِ تقدیر سے
آئے باندہ سے مقید ہو کے ہم — سو طرح کی ذلت و تحقیر سے
کوٹھری تاریک پائی مثل قبر — تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
پھر الہ آباد لے جائے گئے — ظلم سے، تلبیس سے، تزویر سے
جو الہ آباد میں گزرے ستم — ہیں فزوں تقریر سے، تحریر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں — ناتواں تر قیس کی تصویر سے
سوئے مشرق لائے مغرب سے مجھے — تھی غرض تقدیر کو تشہیر سے

منیر کی زندگی انڈمان میں کس طرح گزری، کیا کام ان کے سپرد تھا، ان کا زیادہ تر وقت کن اشغال میں گزرتا تھا اور ان کے دل و دماغ کی کیا حالت تھی ان تمام امور کا ذکر بھی ان کے قطعات میں ملتا ہے، انھیں پانی کھینچنے یا بیل گھوڑے وغیرہ رکھانے کا کام سپرد نہ کیا گیا تھا اور نہ "چکی کی مشقت" ہی ان کے ذمہ تھی، بلکہ وہ کمشنر کے محکمہ میں منشی تھے۔ ظاہر ہے یہ کام انکے لئے چنداں مشکل نہ تھا۔

تھے قید ہم جزیرۂ دریائے شور میں، — نیرنگ گردشِ فلک نیل رنگ سے
منشی تھے محکمہ میں کمشنر کے ہم وہاں — محفوظ تھے مشقت بیل و کلنگ سے
انعام میں معاف ہوئے ہم کو دو برس — شکر خدا رہا ہوئے کام نہنگ سے

محکمہ کے کام سے فراغت ملنے پر مولانا فضل حق خیر آبادی کی صحبت میں وقت گزارتے تھے یا پھر حضرت علی اور امام حسین وغیرہ کی شان میں قصیدے اور قطعات کہتے تھے اور اپنی رہائی کی دعا کرتے تھے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی سے بھی انھیں بڑی عقیدت تھی۔ چنانچہ اپنے ایک قصیدے میں ان کے متعلق لکھتے ہیں:

مخزن فضل و کمال عالم عالی مقام — ناقد تازی زباں نبض شناس سخن
مولوی بے نظیر، فضل حق اسم شریف — دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و مومتن،
قید میں، میں اور وہ رہتے تھے ایک ہی جگہ — عین سمندر میں تھے غرقۂ بحر محن
نصف قصیدہ کیا شان میں ان کے رقم — ختم ہوا جب تو تھے ہمدم گور و کفن[1]

منیر کو انڈمان میں گو جسمانی مشقت نہ برداشت کرنی پڑتی تھی لیکن عزیزوں سے جدائی اور لکھنؤ کی یاد ان کے دل پر تیر کا کام کرتی تھی اور منیر کے کلام میں اگر کہیں سوز و گداز ملتا ہے تو صرف ان چند رباعیوں، قطعوں یا تضمینوں میں جو انھوں نے انڈمان کی زندگی میں کہے:

جس روز سے دخل بے بسی نے پایا — ہونٹوں کا نہ قرب ہنسی نے پایا
اپنا ساتھی تمام دنیا میں منیر — ڈھونڈھا تو مجھی کو بے بسی نے پایا

ایک اور تضمین سنئے جس میں انھوں نے "للہ یا علی میری امداد کیجئے" پر مصرعہ لگائے ہیں:

ظاہر کمال رحم خدا داد کیجئے — قید طال و رنج سے آزاد کیجئے
برباد ہے غلام اب آباد کیجئے — گھبرا رہا ہوں جلد مجھے شاد کیجئے
للہ یا علی مری امداد کیجئے

اہل زمانہ کو مری ایذا پسند ہے — مدت سے مضطرب ہوں رہ چارہ بند ہے
چاروں طرف حصارِ مصائب بلند ہے — تعویذ کار گر نہ عمل سودمند ہے
للہ یا علی مری امداد کیجئے

اک بار جس نے آپ سے امداد کی طلب — فوراً مدد کی آپ نے اے معشرِ عرب
سوئے نجف پکار رہا ہوں میں روز و شب — کی آج تک حضور نے تاخیر لیکن اب
للہ یا علی مری امداد کیجئے

آخر کار ان کی دعا قبول ہوئی اور ۱۸۶۵ء میں انھیں رہا کیا گیا۔ کلکتہ کو واپس آتے ہوئے لکھتے ہیں:

بارے آئی نجات کی باری — کھل گیا عقدۂ گرفتاری
ہم کو منصب ملا رہائی کا — قید کو جائداد بیکاری
کوچ ٹھہرا مقام غربت سے — اب وطن چلنے کی ہے طیاری

---

[1] مولانا نے ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء کو وفات پائی۔

رخصت اے دوستان زندانی، الوداع اے غمِ گرفتاری

.....

دال چاول سے کہدو رخصت ہوں پانی میں ڈوبے یہ نمک کھاری
مچھلیوں سے کہو کہٹ کے سڑیں گھاس کھودے یہاں کی ترکاری
چینی، برمی، ملائی، مدراسی اہلِ آسام، جنگلی، تاتاری
اپنے دیدار سے معاف کریں اپنی باتوں سے دیں سبک ساری
کالے پانی سے ہوتے ہیں رخصت اشک شادی ہیں آنکھوں سے جاری
نظر آیا سواد کلکتہ ..... شکر ہے شکر حضرت باری

کہا جاتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں کے ہاں ایک دن محفل رقص و سرود منعقد تھی۔ ایک گوئے نے منیر کی مشہور غزل "شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے" سُنائی۔ نواب اس غزل کو سنکر بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے بھی اسی زمین میں ایک غزل کہی:

ناظم، منیر آئے یہاں ہم ہیں قدر داں شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

لیکن جب نواب صاحب کو معلوم ہوا کہ منیر کو تو عبور دریائے شور کی سزا ہو گئی ہے تو انھوں نے گورنمنٹ سے منیر کی رہائی کی سفارش کی جب منیر رہا ہو کر آئے اور انھیں نواب صاحب کی تاثر پذیری کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے نواب کے شعر "شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے" پر تضمین کی اور نواب کلب علی خاں کی مسند نشینی پر ایک قصیدہ بھی پیش کیا، نواب صاحب نے انھیں طلب کر لیا۔ منیر نے اپنی اسی تضمین میں اس تمام روداد پر روشنی ڈالی ہے:

آیا منیر چھوٹ کے جب قید سے یہاں تھا قصد رام پور کو ہو جاؤں میں رواں
لیکن حضور ہو گئے راہی سوئے جناں اب کس کے پاس جاؤں میں ہو کون قدر داں
نادم رہا میں اپنے کمالوں کے سامنے

نواب پاک کلب علی خاں نے اے منیر بلوا کے رام پور میں کیں بخششیں کثیر
صد شکر آئے راہ پہ اب طالع فقیر ہے قدر داں سر پہ امیر فلک سریر
اب سرخرو ہوں اپنے کمالوں کے سامنے

منیر کی بقیہ تمام زندگی رام پور میں بڑے عیش و آرام سے گزری۔ آخر ۱۸۸۱ء میں ہیضہ میں انتقال کیا۔ "انتقال منیر عالی قدر" سے سن وفات نکلتا ہے۔

منیر نے لکھا ہے کہ اگر میرا تمام سرمایۂ کلام زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہتا تو سات آٹھ دیوان مکمل ہو گئے ہوتے۔

گو بعض حضرات کو میرے اس دعویٰ میں شک ہے" یہ دعویٰ منیر نے منتخب العالم کی اشاعت کے وقت کیا تھا جبکہ ان کی عمر صرف پینتیس سال کی تھی۔ اس وقت تک وہ شاعری کے علاوہ رسالہ اعلان حق، سراج المنیر اور رسالہ تبنیہ الشائبین بفضائل الثقلین بھی تصنیف کر چکے تھے۔ رہائی کے بعد ایک مثنوی معراج المضامین اور ایک دیوان "نظم منیر" اور شایع ہوا۔ اس طرح ان کا تمام سرمایۂ فکری بیس پچیس ہزار اشعار کے قریب ہوتا ہے۔

منیر کی شاعری پر اظہار خیال کرنا، بالواسطہ لکھنؤ کے دبستان شاعری پر تبصرہ کرنا ہے۔ ان میں اپنے اساتذہ ناسخ اور رشک کی تمام خوبیاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں۔ وہی ابتذال، وہی معاملہ بندی، وہی خارجیت وہی متبذل اور بے کیف تشبیہات، وہی لب ولہجہ کی نسائیت جس کے لئے لکھنؤ بدنام ہے ان میں پوری طرح پائی جاتی ہے ان کے رنگ تغزل کو واضح کرنے کے لئے صرف ایک غزل پیش کی جاتی ہے:

حالِ دل وحشت میں اخفا ہوگیا — پیرہن پھٹ پھٹ کے پردہ ہوگیا
چنبئ رنگوں کا سودا ہوگیا — رختِ عریانی سنہرا ہوگیا
خوب ہم روئے شکستہ دل کے ساتھ — ٹوٹ کر آئینہ دریا ہوگیا
اے صنم، اللہ تیری سرکشی — مشتری ماتھے کا ٹیکا ہوگیا
تیرے چلنے میں پسا مجنوں کا دل — نقش پا لیلیٰ کا چہرا ہوگیا
او صنم دیکھیں بلا گردانیاں — برہمن صدقے کا پتلا ہوگیا
پر لگائے خواہشِ پرواز نے — طائر رنگ اُڑ کے عنقا ہوگیا
دست وحشت بن گیا مجنوں کا دل — خیمۂ لیلیٰ سویدا ہوگیا،
رشک کے فیضِ تلمذ سے منیر — شاعروں میں تو بھی یکتا ہوگیا

"منتخب العالم"[1] جس سے یہ غزل نقل کی گئی ہے۔ منیر کے الفاظ میں "استعارات وکنایات کی طرز" میں ہے غالباً اس سے انکی مراد خیال آفرینی یا خیال بندی ہے (یہی خیال بندی لکھنوی شاعری کی بے کیفی کی بڑی وجہ ہے) منیر کہتے ہیں کہ اپنے دوسرے دیوان تنویر الاشعار میں انھوں نے یہ طرز ترک کر دیا ہے۔ لیکن مجھے ان کے دوسرے دیوان میں بھی کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ لکھنؤ کی شاعری لکھنؤ کے ماحول اور وہاں کی معاشرت کی براہ راست پیداوار تھی اور منیر کے ماحول اور انکے مذاق میں تبدیلی کے بغیر ان کی شاعری میں کسی قسم کا تغیر ناممکن تھا۔ اور ہمیں دیوان اول کے منیر اور ان کے ماحول میں اور دیوان دوم کے منیر اور انکے ماحول میں کوئی فرق نظر نہیں آتا پھر یہ تبدیلی ہو تو کیونکر ہو۔ ہاں رام پور میں یہ ہو سکتا ہے ممکن ہے منیر کے رنگ تغزل میں کوئی تغیر پیدا ہوا ہو کیونکہ وہاں تسلیم، جلال، داغ اور امیر ایسے کہنے والے موجود تھے اور منیر کا ان سے متاثر ہونا قدرتی بات تھی۔ لیکن مجھے "نظم منیر" دستیاب نہ ہو سکا کہ میں اس کی تحقیق کرتا۔

محمد عظیم

[1] ڈاکٹر ابو اللیث صاحب لکھتے ہیں "سکسینہ اس (دیوان) کا نام "منتخبات عالم" بتاتے ہیں جو صحیح نہیں، منتخب عالم تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۲۴ھ برآمد ہوتے ہیں" ڈاکٹر صاحب نے حساب لگانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ "منتخب عالم" سے ۱۳۲۳ھ نکلتے ہیں ۱۲۶۴ھ کے لئے "منتخب العالم" چاہیے۔

یزدانیوں کی موشگافیاں

اور

عیسائیت

اگرچہ انگلستان کا شہرۂ آفاق حکیم لاک صحیح معنوں میں "یزدانی"[1] (Deist) نہیں کہا جاسکتا کیونکہ وہ وحی والہام کا بظاہر منکر نہیں معلوم ہوتا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اس کے فلسفیانہ افکار میں "یزدانیت" (Deism) کے جراثیم پورے طور سے موجود تھے۔ وہ "استدلال" کو "روایتی اور نقلی" قوتوں پر ترجیح دیتا تھا اُس نے اسے نہایت وضاحت سے ثابت کیا ہے کہ "انسانی علم" تجربہ سے ماخوذ ہے، اُس کے نزدیک عقیدہ (Faith) بالکل عقل کے تحت ہے۔ وہ انجیل کے الہامات ضرور مانتا تھا مگر اس کا خیال تھا کہ اگر الہامات عقل کے قطعی فیصلوں کے مخالف ہوں تو اُنھیں مسترد کردینا چاہئے، اُس کے خیال میں الہامات سے اتنا اذعانی علم نہیں حاصل ہوسکتا جتنا عقل سے ہوسکتا ہے، وہ "وحی والہام" کے آستانہ پر سر جھکانے کو موجود تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ کہتا تھا کہ اُس کا علم کیونکر ہو کہ حقیقتاً یہ چیز "وحی والہام" ہے یہ "وحی والہام" کی حیثیت اس قدر مشتبہ ہوجانے کے بعد "یزدانیت" تک پہونچنے کے لئے فاصلہ ہی کتنا رہ گیا۔

ٹھیک اُسی زمانہ میں کہ جب لاک "عقل" کو "نقل" پر ترجیح دینے کی سعی میں مصروف تھا اور عیسائیت کو موافقِ عقل ثابت کرنے کے متعلق اُسنے ایک کتاب لکھی تھی اسکے بعد جان ٹولینڈ "یزدانیت" (Deism) کے علمبردار کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ جان ٹولینڈ، یزدانیوں کی جماعت کا زبردست مفکر سمجھا جاتا ہے۔ اُس نے اس سلسلہ میں "عیسائیت مجموعۂ اسرار نہیں ہے" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو عیسائیوں کی نگاہ میں اس سلسلہ کی بہت ہی خطرناک کڑی ہے۔ اس کتاب کا مرکزی خیال عیسائیت یا مذہبیت کے لئے بظاہر کچھ زیادہ خطرناک نہیں معلوم ہوتا لیکن جس عنوان سے اُسے ثابت کیا گیا ہے اور اس ضمن میں جو بحثیں کی گئی ہیں وہ مذہب کے لئے زہر ہلاہل سے کم نہیں ہیں۔

جان ٹولینڈ نے اس کتاب میں یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اناجیل میں کوئی ایسی شئے نہیں ہے جو عقل کے مخالف ہو یا عقل کی حکومت کے ماورا ہو۔ وہ صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ "عیسائیت" حق ہے اور اس میں ایسی چیزیں نہیں ہوسکتیں

---

[1] Deist کا ترجمہ میں نے "یزدانی" سے کیا۔ اس سے مراد وہ شخص جو "وجود باری" کا قایل ہو لیکن وحی والہام کا منکر ہو۔

جو ہمارے دائرۂ فہم میں نہ سما سکیں، اگر خدا باِفہم ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ الہامات معما ہوں اور ہمیں سمجھانے کے بجائے دوسری اُلجھنوں میں مبتلا کریں، جان ٹولینڈ نے یہ دعوے کر کے کہ عیسائیت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہو سکتی جو ہمارے دایرۂ فہم میں نہ سمائے تمام معجزات کی جڑ کاٹ دی اور الہامات کی یہ خصوصیت بتا کر کہ وہ معما نہ ہوں اور ہمیں سمجھانے کے بجائے دوسری اُلجھنوں میں مبتلا نہ کریں وحی والہام کے اعتقاد کی عمارت گرادی۔

ان اربابِ فکر کی طرف سے عیسائیت کی حمایت کے لئے اس قسم کے جو عنوانات اختیار کئے جا رہے تھے اُن سے حقیقت میں عیسائیت کو کوئی فایدہ نہیں پہونچ رہا تھا بلکہ اُس کی جڑیں اس طریقہ سے کہ وہ عقل کی کسوٹی پر ٹھیک اُترسکے اور زیادہ ہلتی جا رہی تھیں۔

اس سلسلہ میں یہ امر ملحوظ رہنا چاہئے کہ زمانۂ مذکورۂ بالا میں عقل ونقل کی معرکہ آرائی کی یہ خاص خصوصیت تھی کہ عقل کے یہ تمام پرستار (فرانس کے اٹھارھویں صدی کے ممتاز فلسفیوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے) مذہب کی سچائی کا زبان سے اعتراف کرتے تھے لیکن اُن کا اندازِ استدلال اس نوعیت کا ہوتا تھا کہ اس سے اُنھیں عقاید کو صدمہ پہونچے جنکی سچائی کے وہ مدعی تھے، ممکن ہے ان حکماء ومفکرین کا اسلوبِ فکر اسی سانچہ میں ڈھل چکا ہو اور اُن کے بحث ونظر کا ظاہری عنوان اُن کے حقیقی معتقدات کے مخالف نہ ہو لیکن مختلف قرائن سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اُن کی اس روش میں سچائی نہ تھی، اب سوال پیدا ہوگا کہ اُن کے اس منافقانہ طریق کار کا ذمہ دار کسے قرار دیا جائے؟ جواب صاف ہے۔ کلیسا کی غیر رواداری اور سخت گیری کی پالیسی عیسائیت کے ذمہ داروں نے دار وگیر کا جو مسلک اختیار کر رکھا تھا اُس کا نتیجہ یہ ہونا ہی چاہئے تھا کہ مروجہ عیسائیت کے مخالف اپنے خیالات کے اظہار میں فرزانگی وپُرکاری سے کام لیں۔ ذیل کی سطروں سے مسیحی رہنماؤں کی دراز دستیوں کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکے گا۔

محکمۂ احتساب کی دراز دستیاں

عیسائیت قیام امن کی مدعی بن کر آئی تھی۔ امن وآشتی کی تبلیغ اس کا نقطۂ نظر تھا لیکن ستم ظریفی دیکھئے اُس نے انھیں عقاید کی حفاظت کیلئے اس قدر سختیاں کی ہیں کہ ان کے تذکرے سے بھی دل لرز اُٹھتا ہے، عیسائیت کے مخالف خیالات کا بند باندھنے کے لئے پاپائے روم کی حکومت نے محکمۂ احتسابِ عقاید (انکویزیشن) قایم کیا تھا۔ اس خوفناک محکمہ کی سرگرمیوں کے متعلق ڈریپر مصنف "معرکۂ مذہب وسائنس" رقمطراز ہے:

"عام الفاظ میں انکویزیشن کا مقصد یہ تھا کہ تخویف وترہیب کے ذریعہ سے مذہبی اختلافات کا استیصال کیا جائے اور بدعت وزندقہ کو نہایت خوفناک سزاؤں سے وابستہ کیا جائے۔ اس کے یہ معنی تھے کہ اربابِ محکمۂ احتسابِ عقاید ہی کو بدعت وزندقہ کی تعریف وتعیین کا اختیار حاصل ہو اس طور پر معیار حق انکویزیشن کے ہاتھ آگیا اور پاپا کی طرف سے یہ محکمہ مجاز کیا گیا کہ ان ملاحدہ وزنادقہ کی نسبت بعد سراغ برآری تجویز مناسب صادر کرے جو شہروں مکانوں رخانوں

جنگلوں اور کھیتوں میں چھپے ہوئے ہیں۔

اغراضِ مذہبی کے تحفظ کی اس خدمت کی انجام دہی میں اس محکمہ نے ایسی وحشیانہ مستعدی ظاہر کی کہ ۱۲۸۱ء سے لے کر ۱۸۰۰ء تک اس نے تین لاکھ چالیس ہزار اشخاص کو مختلف سزائیں دیں اور اشخاص سزایاب میں سے تقریباً بیس ہزار نفوس زندہ جلائے گئے۔ اول اول جب عامۂ خلایق کو اس کی وحشیانہ سزاؤں کے خلاف اپنی آواز بلند کرنے کی جرأت اور مجال نہ تھی تو بسا اوقات ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ اہل قلم قسیس راہب اور ہر طبقہ کے عوام الناس الزام عاید ہونے ہی بلا اس کے کہ انھیں اپیل کا موقع دیا جائے اُسی دن مار ڈالے جاتے تھے۔ ارباب فکر و دانش کی جدھر نظر پڑتی تھی اُنھیں بھیانک اور ڈراونی پرچھائیاں دکھائی دیتی تھیں۔ کوئی شخص بلا خوف سزایابی آزادانہ رائے کے اظہار پہ قادر نہ تھا" حریتِ فکر کا یوں گلا گھوٹنا اچھے نتائج پیدا ہی نہیں کر سکتا تھا۔ حکمت و دانش کی آوازیں، مذہب کی حمایت کے بھیس میں ظاہر ہونا شروع ہوئیں مگر کٹر عیسائیت کی آوازوں کو دباتی ہوئی۔ اسی معرکۂ مذہب و سائنس مصنفہ ڈریپر سے انکویزیشن کی سخت گیری کی ایک ہیبت ناک مثال سنئے۔ سولھویں صدی میں حکیم برونو کو پرنیکس کی وفات کے بعد پیدا ہوا — برونو کوپرنیکس کے نظام کا حامی تھا اور اپنے خیالات کے اظہار میں بیباک، ابتدا میں برونو کا قصد تھا کہ اپنی زندگی کلیسا کی خدمت گزاری کے لئے وقف کر دے چنانچہ دامینقی فرقہ کے راہبوں میں بھی داخل ہو گیا تھا، لیکن مسئلۂ "عشائے ربانی" "استقرار حمل بحالت دوشیزگی" پر غور کرنے سے اُس کا ایمان مبدل بہ شکوک ہو گیا۔ چونکہ اُس نے اپنے خیالات کے پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی لہذا اُسے بہت جلد پیشوایان دین کا موردِ عتاب ہونا پڑا اور اُن کے پنجۂ عقوبت سے بچنے کے لئے اول سوئزرلینڈ پھر فرانس پھر انگلستان پھر جرمنی میں پناہ لینا پڑی لیکن انکویزیشن کے جاسوس جن کی قوت شامہ بلا کی تیز تھی برابر اُس کے پیچھے لگے رہے اور آخر جب وہ اٹلی واپس آیا تو اُس کا کھوج لگا کر رہے۔ وینس میں وہ گرفتار کیا گیا اور بیامبی کے جیل میں چھ سال تک اس سختی سے قید رکھا گیا کہ: اُسے لکھنے کے لئے قلم دوات کاغذ دیا جاتا نہ پڑھنے کے لئے کوئی کتاب دی جاتی تھی اور نہ اُس کے کسی دوست کو اجازت تھی کہ اس قید تنہائی میں آکر گھڑی دو گھڑی کے لئے اُس سے ملے اور اُس کا غم غلط کرے۔ پیشوایان مذہب کے مطالبہ پر حکیم برونو وینس سے روما کو منتقل کیا گیا اور اس الزام کی پاداش میں کہ وہ ملحد ہی نہیں بلکہ راس الملاحدہ ہے محکمۂ احتساب کے مجلس میں قید کیا گیا۔ سب سے بڑا الزام اُس پر یہ تھا کہ وہ "تعدد عوالم" جیسے ناپاک مسئلہ کا قایل ہے جو کتب مقدسہ کے سیاق اور آیاتِ الہامی سے تناقضِ کلی رکھتا ہے ——— دو سال تک قید کاٹنے کے بعد وہ حاضرِ عدالت کیا گیا اور حکامِ عدالت نے اس پر فرد قرار دادِ جرم لگا کر اُسے مسیحی برادری سے خارج کر دیا اور جب مقدس عدالت کے اس حکم کی تعمیل سے اُس نے انکار کیا کہ اپنے گناہ سے توبہ کرے تو کارفرمایانِ قضا و قدر یعنی حکامِ انکویزیشن نے اس سفارش کے ساتھ اُسے دنیوی حکام کے سپرد کر دیا کہ اُسے نہایت نرمی سے سزا دی جائے

اور یہ خیال رکھا جائے کہ اس کے خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے۔ عدالت انکویزیشن کے اس خوفناک فقرے کا مطلب ایسے موقعوں پر یہ ہوا کرتا تھا کہ مجرم کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ چونکہ حکیم برونو اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کے دشمن اگرچہ اُس کے جسم کو فنا کر سکتے ہیں لیکن اُس کے خیالات کی اشاعت نہیں روک سکتے۔ اُس نے اپنے ججوں کو مخاطب کر کے کہا کہ "تمھارے اس فیصلہ کو سن کر میرے قلب پر اُس خوف کا عشر عشیر بھی طاری نہیں جو خود تمھارے دل میں اسکے صادر کرتے وقت پیدا ہوا ہوگا"۔ اس فیصلہ کی تعمیل فروری ۱۶۰۰ء میں ہوئی اور برونو زندہ جلا دیا گیا ——

—— انصاف کا مقام ہے کہ اس قسم کی ہولناک انتقامی سزاؤں اور دل دہلا دینے والی خونیں عقوبتوں کی موجودگی میں عام اربابِ فکر و دانش اپنے خیالات آزادی سے کیونکر ظاہر کر سکتے تھے۔ اس عام مذہبی تشدد کی فضا میں مخالف زاویوں سے اُن سوچنے والوں کے لئے جو یوں جان دینے کے واسطے آمادہ نہ تھے اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ وہ برابر عیسائیت کا روپ دھارے رہیں ؎

ز شیخِ شہر جاں بردم بہ تزویرِ مسلمانی مدارا گر بہ ایں کافر نمی کردم چہ می کردم

اس میں شک نہیں کہ عیسائیت کیلئے اُن کی کھلم کھلا بغاوتیں اتنی ہرگز مضر نہیں ہو سکتی تھیں جتنی کہ ان کی یہ مصلحت آمیز حمایتیں ہوئیں۔ اُن کے افکار و آرا نے کلیسا کی دیواروں میں خوفناک سوراخ پیدا کر دئے۔ وہ ہمیشہ یہ ظاہر کرتے رہے کہ اُنکے نظریۂ عیسائیت کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتے۔ عقیدہ اور دلیل کی حدیں ایک دوسرے سے الگ ہیں، وہ الہامی کتابوں پر براہِ راست کسی قسم کا اعتراض نہیں کرتے تھے لیکن مخفی راستوں سے اُنھیں فضول و بے معنی ثابت کرتے تھے۔ "مذہبی کٹر پنے" کے احترام کا اُنھیں برابر ادعا رہا لیکن زبان و قلم سے ایسے خیالات ادا ہوتے رہے جن سے اس جذبۂ احترام کو کوئی مناسبت ہی نہ ہو سکتی تھی۔ عقل جن اُمور کی غلطیوں کا پردہ فاش کرتی تھی وہ بسا اوقات اُنھیں مذہب کے دایرہ میں صحیح بتاتے تھے اُس عصر کی ادبیات کا مطالعہ اس قسم کے شواہد بکثرت مہیا کر سکتا ہے۔

عیسائیت اور بائیبل

بائیبل حکیم لاک کا معاصر تھا۔ وہ آمسٹرڈم میں رہتا تھا۔ اُس نے وہیں سے اپنی "فلسفیانہ لغت" شایع کی تھی وہ دراصل بالکل آزاد خیال تھا عیسائیت اور مذہبیت کا لباس اُس نے اپنے سے کبھی علٰحدہ نہیں کیا۔ عیسائیت کے بنیادی قوانین و اُصول کے خلاف جو اعتراض منکرین کی طرف سے کئے گئے تھے اُنھیں باقاعدہ طور سے درج کرنے میں اُسے نہایت مسرت ہوتی تھی۔ حضرت داؤد کے متعلق عیسائیت جن واقعات کو بیان کرتی تھی اُن کی مجرمانہ حیثیت اُس نے اپنے خیال میں نہایت بیدردی سے نمایاں کی اور بتایا کہ خدا کا یہ عزیز بندہ عیسائی روایتوں کے مطابق ایسا شخص تھا جس سے مصافحہ کرنے میں عامی سے عامی شخص کو عار معلوم ہونا چاہئے۔ اُس نے اس خصوص میں جو انداز بیان اختیار کیا وہ انتہا پسندانہ تھا۔ عیسائی دنیا کا اس بے باکانہ اظہار خیال پر بیحد برافروختہ ہوئی۔ اُس نے مزعومہ عیسائیت کی بارگاہ میں اس گستاخی کے خلاف احتجاج کیا اور زبردست احتجاج کیا۔ ہر طرف ایک ہنگامہ

برپا ہوگیا اور قریب تھا کہ عیسائیت کے قہر و غضب کی بجلیاں اُس کا خرمنِ حیات پھونک دیں کہ وہ سنبھلا اور اُس نے مذہب اور عقل کی حدوں کے علٰحدہ ہونے کی بحث چھیڑ کر مسیحی دنیا کے بگڑے ہوئے تیوروں کو درست کرنے کی کوشش کی

بائیل نے عیسائیت کے خشم و عتاب کے شعلوں کو اس دلچسپ نظریہ کے چھینٹوں سے بجھانا چاہا کہ عقیدے کی مذہبی فضیلت اس میں ہے کہ الہامی سچائیوں کا اعتقاد تنہا خدا کی شہادت پر کیا جائے۔ اگر تم دلایل کی بنا پر روح کے غیر فانی ہونے کے قایل ہو تو اس میں شک نہیں کہ تمھیں کٹر مذہبی کہا جا سکتا ہے، لیکن جس چیز کا نام عقیدہ (faith) ہے اُس کا تمھیں کوئی حصہ نہیں ملا ہے، جس قدر الہامی سچائیاں انسانی عقل کی دسترس سے باہر ہوتی ہیں، اُسی قدر ناقابل فہم اور دلایل کے خلاف ہوں گی اور ہمیں اسی قدر اُن کے تسلیم کرنے میں اپنے فہم و ادراک کی قربانی کرنا ہوگی اور ہماری اطاعتِ خدا کا درجہ اتنا ہی اونچا ہو جائے گا۔

بائیل نے عقیدے کی عظمت کا جو معیار قرار دیا ہے وہ نہ صرف سفسطہ آمیز بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔ ظاہر ہے جو مذہب جس قدر زیادہ خرافات و مزخرفات کا مجموعہ ہوگا اُس کے تسلیم کرنے میں اُسی قدر عقل کی قربانی دینا ہوگی اور اسلئے بائبل کے مذاق کے بموجب ان کے تسلیم کرنے میں اُتنا ہی اطاعتِ خدا کا درجہ بڑھتا جائے گا گویا مزخرفات و خرافات کے انبار کے سامنے عقل کا سربسجود ہونا ہی "ربانیت و روحانیت" کے اعتراف کا پیش خیمہ ہوگا۔ کوئی فہمیدہ مذہبی شخص اس عجیب صورت حال کے تسلیم کرنے پر راضی نہیں ہو سکتا۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بائیل نے اس نظریہ کے ذریعہ سے ایک طرف تو عقیدے کا لطیف پیرایہ میں مضحکہ اُڑایا ہے اور دوسری طرف عیسائیت کے انتقام کے چنگل سے اپنے کو بچایا ہے اور اگر بائیل نے فی الحقیقت سنجیدگی سے اس خیال کا اظہار کیا ہے تو مفکرین کی جماعت میں اس کا پایہ نہایت ہی پست ماننا پڑتا ہے۔

مفکرینِ خدا اور اخلاقی فضایل

بائیل نے اپنی لغت میں مفکرینِ خدا کے اخلاقی فضایل کا اعتراف کیا تھا۔ یہ بات بھی مذہبی حلقوں میں ناپسند ہوئی اور بائیل کے اس نقطۂ نظر کو سختی سے موردِ اعتراضات بنایا گیا، اُس نے ان اعتراضات کے جواب میں جو ستم ظریفانہ روش اختیار کی ہے وہ بھی خیالِ سابق کی موید ہے۔ بائیل نے لکھا ہے:

"اگر اُسے خدا کے اُن منکرین کا علم ہوتا جن میں اخلاقی برائیاں پائی جاتی ہوتیں تو وہ ان کا ضرور تذکرہ کرتا، لیکن بدقسمتی سے وہ ایسی جماعتِ ملاحدہ سے واقف نہیں ہے جن میں اخلاقی رزایل پائے جاتے ہوں۔ وہ تاریخی مجرمین جنکے جرایم کے تذکرے سے انسان کانپ اُٹھتے ہیں ہمیشہ مذہبی جماعت سے تعلق رکھتے رہے ہیں۔ ان کی غیر مقدس زندگیاں انکی مذہبیت کا ثبوت ہیں، مذہب کا یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ شیطان خدا کے منکر ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور وہی درحقیقت جرایم و معاصی کی طرف لوگوں کو ترغیب دلاتا ہے۔ اس لئے انسان کی شرارت کو شیطان کی شرارت سے مشابہ ہونا چاہیئے

اور یہیں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انسان کی شرکت شیطان کے ساتھ خدا کے اعتقاد میں لازمی ہے۔ بدترین سیہ کاروں کا منکرین خدا نہ ہونا اور ایمانداری کے وصف سے ایزد ناشناسوں کا زیادہ تر متصف ہونا خدا کی غیر محدود عقلمندی کا ثبوت ہے اس انتظام سے اُس نے انسان کے بگڑنے کی حدیں مقرر کر دی ہیں کیونکہ اگر انکارِ خدا اور اخلاقی شرارتیں ایک ہی جماعت میں موجود ہو جاتیں تو پھر دنیا کی انسانی سوسائٹیاں جرائم و معاصی کے طوفان سے ہمیشہ زیر و زبر رہتیں"۔

ان ستم ظریفانہ تاویلات کی جو حیثیت ہے وہ ظاہر ہے۔ اگر فی الواقع انھیں کوئی شخص سنجیدگی کے ساتھ پیش کرتا ہے تو اس کی "فکری سادہ لوحی" میں کیا شک ہے؟ صحیح صورتِ حال تو یہ ہے کہ "خوش کرداری اور لامذہبیت" میں کسی قسم کا لزوم نہیں ہے۔ بائیل نے جس عنوان سے ان میں لزوم دکھانا چاہا ہے وہ منبر کی چیز ہے اور کسی خطیب کی زبان سے ادا ہونے والی چیز۔ مسندِ درس کی حکیمانہ نکتہ آفرینیوں سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ یہ کس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ بائیل کو اُن منکرینِ خدا کا علم نہیں ہے جن میں اخلاقی برائیاں پائی جاتی ہوں۔ ہمارے سامنے آج بھی ایسے منکرینِ مذہب موجود ہیں جن میں مسلمہ اخلاقی ضوابط و قوانین کے لحاظ سے کج روی پائی جاتی ہے اور جن کی زندگی کو کسی نہج سے پاکیزہ نہیں کہا جا سکتا مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ منکرین مذاہب خوش کردار اور پاکیزہ سیرت ہوتے ہی نہیں، یقیناً ایسے لامذہب افراد بھی موجود ملتے ہیں جن کی نیک کرداری اور خوش سیرتی کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کی زندگی کا ہر پہلو خواہ وہ انفرادی حیثیت رکھتا ہو یا اجتماعی حیثیت صاف ستھرا ہوتا ہے۔ وہ راستباز ہوتے ہیں، صادق اللہجہ ہوتے ہیں۔ اُن کے دل میں ملک و ملت کا درد ہوتا ہے۔ جس سماج سے وابستہ ہوتے ہیں اُس کی معاشرتی حالت درست کرنے کی اُنھیں فکر رہتی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ ان خوش کردار لامذہبوں کی ان اخلاقی و معاشرتی صلاحیتوں کا چشمہ لامذہبیت کے منبع سے نہیں پھوٹتا ہے۔

غرضکہ بائیل کی عیسائیت کی حمایت کے لہجہ کا عام انداز یہی ہے، ظاہر ہے اس حمایت سے عیسائیت کیا فائدہ اُٹھا سکتی تھی ان دلایل سے تو وہ اور زیادہ خلافِ عقل ثابت ہوتی جاتی تھی اور اُس کی مقبولیت کی دیواریں گرتی جاتی تھیں، بائیل کی تصنیفات کا اثر انگلستان اور فرانس پر اچھی طرح پڑا۔ اُنھوں نے ان دونوں ممالک میں مخالفینِ عیسائیت کے لئے اسلحہ مہیا کر دئے۔

ابتدا میں اس حملہ کو نہایت سرگرمی سے برطانوی یزدانیوں (Deists) نے جاری رکھا۔ انھوں نے اپنی تصنیفات کے ذریعہ سے عیسائیت کی بنیادیں بہت کچھ ہلا دیں۔ ان یزدانیوں اور کٹر عیسائیوں میں یہ سوال زیر بحث رہا کہ آیا خدا کا وجود عیسائی تصور کے تحت عقل سے ثابت کیا جا سکتا ہے اور آیا وہ خدا "عیسائی الہامات" کا موجد ہو سکتا ہے۔ یزدانیوں کے مقابلہ میں گو دلیل ہی پر اعتماد کیا گیا لیکن "اہلِ تدبیر کی واماندگیوں" نے "آبلوں پر بھی حنا ہی باندھی" اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سلسلہ میں بہت سے عیسائی اپنے عقاید سے ہٹتے گئے۔ "توحید فی التثلیث" کے متعلق عجیب

عجیب خیالات ظاہر کئے گئے۔ اس دور کی یہ خاص خصوصیت رہی ہے کہ اس زمانہ میں اخلاقیات پر ہر گروہ نے خصوصیت سے زور دیا ہے، عیسائیت کا یہ خیال تھا کہ آخرت کے ثواب وعقاب کا اُصول اخلاقی اصلاح کے لئے ضروری ہے ان یزدانیوں کا خیال تھا کہ اخلاق کی بنیاد محض عقل پر ہے، موجودہ الہامات میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو صحیح اخلاقی قوانین کے بالکل مخالف ہیں۔ ان یزدانیوں نے اسپنوزا کے اس خیال کو کہ الہامی کتابوں کی بھی دوسری کتابوں کی طرح تاویل کرنا چاہئے اپنا خاص اُصول قرار دے لیا تھا۔ وہ قانون کی زد سے بچنے کے لئے اپنے یہ خیالات ہلکے ہلکے پردوں میں چھپا چھپا کر پیش کرتے رہے، لیکن ابھی ۱۶۱۲ء کا پریس لائسنسنگ ایکٹ موجود تھا۔ وہ اس قسم کے ادب کی اشاعت کامیابی کے ساتھ روکتا رہا۔ ۱۶۹۵ء میں یہ قانونِ مطابع منسوخ ہوا اور اُس وقت "یزدانی ادب" (Deistic Literature) کا ظہور قوت کے ساتھ شروع ہوا تاہم اب بھی قوانین کفر والحاد موجود تھے۔ اُن میں اتنی طاقت بہرحال تھی کہ اُن کے ذریعہ سے مخالفینِ عیسائیت کا سر کچلا جا سکے۔ ۱۶۹۸ء میں حسب ذیل ایک جدید قانون اور بنا دیا گیا تھا۔ "اگر کوئی شخص جسکی تعلیم عیسائی مذہب میں ہوئی ہے تحریراً یا تقریراً یا طباعۃً تثلیث کے اقانیم ثلثہ میں سے کسی کی ربوبیت کا بھی انکار کرے گا یا ایک خدا سے زیادہ خداؤں کا عقیدہ ظاہر کرے گا یا عیسائیت کی سچائی کا منکر ہوگا یا قدیم وجدید اناجیل کی ربانی حیثیت تسلیم نہ کرے گا تو وہ مجرم قرار دیا جائے گا۔ پہلے جرم پر پبلک ملازمتوں کا استحقاق اُس سے چھین لیا جائے گا اور دوسرے جرم پر اُس کے شہری حقوق ضبط ہو جائیں گے اور تین سال کی قید جھیلنا ہوگی"۔

قانون بالا کا منشا بتاتے ہوئے صاف صاف ظاہر کر دیا گیا تھا کہ بہت سے لوگوں نے کھلم کھلا عیسائیت کے اُصولوں کے خلاف ملحدانہ گفتگوئیں کرنے اور خیالات شایع کرنے کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔

آزاد خیالی استعاروں کی آڑ سے

قانونِ بالا فلسفیانہ آزاد خیالی کے لئے پورا نقصان رساں تھا لہذا اس کی زد سے بچنے کے لئے آزاد خیالوں نے بہت سے طریقے اختیار کئے۔ مذہبی امور میں منافقانہ عنوان سے بحث ومباحثہ کے طریقہ کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اس مقام پر دوسرے لطیف طریقے کا ذکر منظور ہے جس کا سرچشمہ بھی حقیقۃً پہلا ہی طریقہ ہے۔ حریتِ فکر کی دیوی کے پرستاروں نے مقدس کتابوں کی استعاروں کے پردے میں حسبِ منشا تاویلیں شروع کر دیں۔ انھوں نے مخصوص عنوان کے دلایل وبراہین کی آڑ لے کر یہ صاف صاف لکھنا شروع کر دیا کہ ان کتبِ مقدسہ کے لفظی ترجموں پر اگر اعتماد کیا جاتا ہے تو بہت سی مہمل باتیں ماننا پڑتی ہیں۔ ایسی بہت سی چیزیں تسلیم کرنا ناگزیر ہو جاتی ہیں جو خدا کی حکمت ومعدلت کے منافی ہیں اس لئے ان مقامات کا مجاز واستعارے پر محمول کرنا لازمی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ ایک حد تک عقل کے موافق ہے۔ مجاز واستعارہ کا استعمال تمام زبانوں میں رائج ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ کتب مقدسہ میں یہ استعمالات نہ پائے جاتے ہوں لیکن اس کو اڑھنا بچھونا بنا لینا اور جو بات ذرا سی بھی اپنی عقلِ تنگ مایہ کے خلاف معلوم ہو اُسے بعید مجازات پر محمول کر دینا ان کتب مقدسہ کے ساتھ انصاف نہیں ہے

اُس زبان کے رائج اسالیب اظہار خیال اور ان کتب کے عام اندازِ بیان کا صرف لحاظ رکھنا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اُس مذہب اور اُن کتابوں میں انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افکار و خیالات کی جو عام روح پھیلی ہوئی ہے اُس کا پورے طور سے خیال رکھنا بھی ناگزیر ہے۔ یہ چیز ہر متفلسف کے بس کی نہیں ہے۔ اس کے لئے ایسے صاف ستھرے حکیمانہ ذوق کی ضرورت ہے جس کا خمیر عقلی پختگی اور ادبی تربیت کے باہمی اختلاط سے طیار ہوا ہو۔ اگر کسی کتاب مقدس کی کوئی تعلیم ہمیں عقل کے خلاف معلوم ہوتی ہے اور ہم اسے کسی طور سے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے تو خواہ مخواہ مضحکہ خیز مجازات کی عمارت تعمیر کر کے اُسے عقل کے عین موافق ثابت کرنا فکری دیانت نہیں ہے، ہمیں جرأت سے اس کا انکار کرنا چاہئے اور اس انکار کے نتیجہ میں جو سلسلۂ فکر طیار ہوتا چلا جائے اُس سے وابستگی ہی کو اپنے لئے ایمان سمجھا جائے لیکن مجبوری یہ تھی کہ اُس وقت کی عیسائیت کی سخت گیری نے آزاد خیالوں کو اس پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ عقلی دیانت کا راستہ چھوڑ کر یہ روش اختیار کریں، یہ بالکل واضح ہے کہ اگر اُس وقت کے مذہبی حلقے حریتِ فکر کے دشمن نہ ہوتے تو آزاد خیالوں کی ایک جماعت کو اسکی ضرورت ہی نہ پڑتی کہ وہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے خواہ مخواہ کتب مقدسہ کے بیانات کو استعارات و مجازات پر محمول کرنے کے طریقوں سے کام لیں۔ اُس وقت کی عیسائیت نے یہ محسوس نہیں کیا لیکن اس میں شک نہیں کہ ان حملوں کی حیثیت شبخون کی تھی اور کلیسا کو ان سے کافی نقصان پہونچا مگر اس کی ذمہ دار خود عیسائیت تھی۔ ان یزدانی مفکروں نے یہ بحثیں اس عنوان سے چھیڑی تھیں کہ ان کے پڑھنے والے ان الہامی کتابوں کے بیانات کی طرف سے بد دل ہوتے گئے اور انکے دلوں سے ان کا وقار زایل ہوتا گیا۔

معجزوں کی بحث کالنز اور وولسٹن

معجزوں (Miracles) کی بحث اس زمانہ میں تیزی سے چھڑی رہی۔ کالنز اور وولسٹن نے انجیلی معجزوں اور پیشین گوئیوں کی ظاہری حیثیت کے خلاف سختی سے تنقیدیں کیں۔ انھوں نے نہایت فرزانگی کے ساتھ معجزات وغیرہ کے فی نفسہٖ ممکن ہونے یا نہ ہونے کی بحث کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔ البتہ بہت سے معجزات کو فرداً فرداً لے کر یہ واضح کیا کہ یہ چیزیں مہمل ہیں یا معجزہ دکھانے والے کے شایان شان نہیں ہیں، ان معجزوں اور پیش گوئیوں کی ظاہری حیثیتوں کو اس طرح کمزور اور بے وزن ثابت کرنے کے بعد اس نظریہ پر زور دیا کہ یہ معجزات درحقیقت استعارہ ہیں حضرت مسیح کے اُن عجیب و غریب و غیر قابلِ فہم تاثیرات و اعمال سے جن کی انسانی روح میں وہ برابر تخلیق کرتے رہتے ہیں، کالنز کو اپنے خیالات کی اشاعت کے سلسلہ میں زیادہ مشقتیں جھیلنا نہیں پڑیں البتہ وولسٹن اپنی معجزات کے متعلق کتاب لکھ کر مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔ وہ سڈنی سکس کالج کیمبرج کا فیلو تھا۔ اُس سے یہ اعزاز چھین لیا گیا اور اس پر لائبل کیس چلایا گیا۔ جرمانہ اور ایک سال کی قید کی سزا اُسے دی گئی۔ وہ جرمانہ ادا نہ کر سکا اور جیل ہی میں مر گیا۔

ایک پر لطف واقعہ

وولسٹن نے اس سلسلہ میں جو رسایل لکھے تھے اُنھوں نے عام پبلک پر اچھا خاصا اثر

ڈالا تھا۔ اس کے متعلق ایک واقعہ مشہور ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے خالص مذہبی طبقہ کتنا برہم تھا۔ وہ ایکمرتبہ کہیں خراماں خراماں گھومتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ ایک خوش مزاج نوجوان عورت اُسے ملی، بجائے اس کے کہ وہ سلام کرتی اُس نے یہ سوال کیا کہ "او بڈھے شیطان تجھے اب تک پھانسی نہیں ہوئی"۔ وولسٹن یہ عجیب و غریب سوال سن کر کھڑا ہو گیا اور اُس نے حیرت سے دریافت کیا کہ "اے نیک خاتون میں تم سے واقف نہیں ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ میں نے تمھاری برہمی کی کون سی بات کی ہے۔ آخر تم مجھ سے اس قدر ناراض کیوں ہو؟" اس عورت نے بگڑ کر جواب دیا کہ "تم نے میرے معین و نجات دہندہ کے خلاف قلم اُٹھایا ہے۔ اس سے بڑھ کر برہمی کی کون سی بات ہو سکتی ہے"۔

برطانیہ کے مشکک فلسفی ڈیوڈ ہیوم پر بھی اسی سے ملتا جلتا واقعہ گزرا ہے، وہ غریب کسی مقام پر دلدل میں پھنس گیا تھا۔ اُس نے مدد کے لئے اُس طرف سے ایک گزرنے والی بڑھیا کو پکارا۔ اس بڑھیا کو ایسے شخص کی اعانت کرنے میں تردد ہوا جو معجزات کے مخالف ایک مضمون لکھ چکا ہو۔ ہیوم نے کہا کہ اے نیک دل عورت کیا تمھارا مذہب یہ نہیں بتاتا کہ تمھیں دشمن کی بھی مدد کرنا چاہیئے، عورت نے جواب دیا۔ یہ سچ سہی لیکن اس دلدل سے تم اس وقت تک باہر نہیں نکالے جا سکتے جب تک کہ سچے عیسائی نہ بن جاؤ۔ ہیوم نے موقع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے فوراً اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور اس مصیبت سے رہائی حاصل کی۔

ہیوم کا ذکر یہاں ضمناً آگیا۔ تذکرہ وولسٹن اور کالنز کا تھا۔ یہ دونوں یزدانیوں کی جماعت میں کچھ بڑے پایہ کے مفکر نہ تھے۔ اوسط درجے کے فہم و دانش کے انسان تھے مگر انھیں اپنے خیالات کی اشاعت میں بہت زیادہ انہماک تھا اسلئے وہ اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیاب رہے۔

ٹنڈل اور الہامات

اس زمانے میں میتھوٹنڈل نے ذرا زیادہ وسیع نقطۂ نظر لے کر الہامات پر حملہ کیا۔ ۱۷۳۰ء میں اُس نے (کرسچینٹی ازاولڈ اکز ھیبشن) نامی کتاب لکھ کر یہ ظاہر کیا کہ انجیل بطور ایک الہامی چیز کے محض فضول ہے کیونکہ اس سے انسان کے اس فطری مذہب میں کوئی اضافہ نہیں ہوا جسے خدا نے سب سے پہلے ہم پر عقل کے توسط سے القا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو لوگ الہامی مذہب عیسائیت کی اس لئے حمایت کرتے ہیں کہ وہ فطری مذہب کے منافی ہے اور اس طرح عقل و نقل دونوں کی دوہری حکومت قائم کرتے ہیں وہ ایک عجیب استدلالی مخمصہ "دَور" (Reasoning Circle) میں گرفتار ہوتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں وہ ان مقدس کتابوں کی سچائی ان نظریات و قوانین سے ثابت کرتے ہیں جو اس میں موجود ہیں اور پھر ان نظریوں کی سچائی کا نتیجہ اس واقعہ سے نکالتے ہیں کہ وہ ان کتابوں میں موجود ہیں۔

انجیل پر تفصیلی تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ اسے غلطیوں سے پاک ثابت کرنے کے لئے اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ جہاں کہیں مخالفِ عقل بیانات ملیں تو اُن کے لئے لفظی معنی ذبح کئے جائیں اور حقیقت سے غیر حقیقت کی طرف آیا جائے تاکہ

استدلال و برہان کی خلاف ورزی نہ ہو۔ انجیل میں جو واقعاتی اور طبیعیاتی غلطیاں بیان کی جاتی ہیں اور جن سے اس کتاب مقدس کے محفوظ عن الخطا ہونے کو صدمہ پہونچ سکتا ہے ان کا جواب دیتے ہوئے ایک بشپ نے لکھا تھا کہ انجیل میں خدا انسانوں کے خیالات اور تصورات کے مطابق گفتگو کرتا ہے کیونکہ وحی اور الہام کا یہ کام نہیں ہے کہ ان معاملات میں اُن کے آرا کی تصحیح کرے ٹنڈل نے اس کا جواب حسب ذیل دیا ہے: "اس جگہ دو امر ہیں ایک تو ہماری غلط منطق اور فصاحت و بلاغت کی اصلاح نہ کرنا اور دوسرے یہ کہ خود ان کا استعمال کرنا۔ دوسرے لفظوں میں ایک بات تو یہ ہے کہ ان چیزوں کے متعلق ہمارے غلط تصورات کی اصلاح نہ کرنا اور دوسرے یہ کہ انھیں کے مطابق گفتگو کر کے ان کو اور مضبوط بنا دینا۔ اس مقدمہ کی تمہید کے بعد وہ نہایت بے باکی سے پوچھتا ہے کہ اس دوسری صورت کا استعمال خدا کیوں کرتا ہے؟۔ کیا غیر محدود و غیر متناہی عقل اس رکیک و سخیف تدبیر کا استعمال کئے بغیر انسانوں کی توجہ حاصل ہی نہیں کر سکتی تھی"۔

ٹنڈل نے عیسائیت کے تنہا ناجی ہونے کے نظریہ کی بھی سختی سے تنقید کی ہے، وہ کہتا ہے "کیا ایسے شخص کے متعلق جو بہشت کا دروازہ اُن لوگوں کے لئے بند کر دیتا ہے جو دلیل و برہان کے احکام کی پابندی کرنے والے ہیں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ انسانوں کا نجات دہندہ بنا کر بھیجا گیا تھا؟"۔

ٹنڈل نے انجیل کی اس قسم کی بہت سی باتوں کی جن سے اس کے خیال میں خدا کے عادلِ مطلق ہونے پر دھبا آتا ہے تنقید کی ہے۔

وولسٹن اور کالنز کے مقابلہ میں ٹنڈل زیادہ نکتہ رس اور دقیقہ سنج تھا، اُس کی تنقیدوں میں زیادہ وزن تھا۔ اُس کی تحریروں سے عیسائیت کو زیادہ نقصان پہونچا۔ کٹر عیسائیت کی بنیادیں گرنا شروع ہو گئیں اور "یزدانی جماعت" کے خیالات کو فروغ ہونے لگا۔

سطورِ بالا میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُن کا تعلق اگرچہ براہِ راست عیسائیت سے ہے لیکن حریتِ خیال اور کٹر عیسائیت کے تصادم کو جن راستوں سے گزرنا پڑا ہے کم و بیش وہی راستے دوسرے مذاہب کو بھی طے کرنا پڑے ہیں کیونکہ تصادم کے پہلو بنیادی حیثیت سے مذاہب اور حریتِ فکر میں اربابِ مذاہب کی عجیب و غریب ذہنیتوں کی وجہ سے ایک ہی ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی تاریخ بھی انھیں خطوط سے گزری ہے اور اب بھی گزر رہی ہے اگرچہ اس گرم سیری اور تیز رفتاری کے ساتھ نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک تازہ واقعہ کا تذکرہ لطف سے خالی نہیں۔

ایک روز میرے ہاتھ میں جناب نیاز فتحپوری کی تازہ تصنیف "من و یزداں" تھی۔ میرے ایک صاحبِ ریشِ دراز مقدس مہربان نے اُسے میرے ہاتھ سے لے لیا، نیاز کا نام اس کے مصنف کی جگہ دیکھتے ہی اُن کی تیوریاں چڑھنا شروع ہو گئیں اور اُنھوں نے اسی برہمی کے عالم میں اُس کے صفحات اس طرف اُس طرف سے پلٹے اور بعض جگہ کچھ پڑھا۔ اب برافروختگی کے عالم میں وہ مجھ پر برس پڑے اور کہنے لگے کہ "من و یزداں" اس کا نام بالکل غلط ہے "من" یہاں درحقیقت "اہرمن" کا

قایم مقام ہے، تم ایسی کتابیں جو الحاد و زندقہ کی ترجمان ہیں پڑھ کر کیوں اپنی دنیا اور عقبےٰ خراب کر رہے ہو۔ ان کتابوں سے خیالات فاسد ہوتے ہیں۔ ایمان برباد جاتا ہے"۔ جب اُن کا جوش ذرا ہلکا ہوا تو میں نے عرض کیا کہ اگرچہ جناب نیاز کے خیالات سے مجھے اکثر معاملات میں بنیادی اختلافات ہیں تاہم وہ اس عصر کے ایک بلند پایہ مفکر ہیں۔ اسلام کے مدعی ہیں۔ اُن کی بعض تحریروں سے جو اسی "من و یزداں" میں ہیں اس کا واضح طور سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خدا اور رسول کے ماننے والے ہیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اُن کے خطوط اعتقاد آپ کے اور عام مسلمانوں کے خطوط اعتقاد سے ہٹے ہوئے ہیں مگر صرف اتنی سی بات اُنھیں مردود و مطرود تو نہیں بنا دیتی۔ اُن کے دلایل پر غور کیجئے، اگر ہو سکے تو اُن کی متانت سے تنقید کیجئے۔ آپ کی یہ غیر روادارانہ روش اسلام کے حق میں بھی قاتل ہے۔ آپ کی اس برہمی و برافروختگی سے نیاز کے افکار و خیالات کا نظام وہ آپ کے اسلام کے مخالف ہی سہی درہم برہم نہیں ہو سکتا۔ آپ جیسے اگر اسلام کے معاون رہے تو سچے اسلام کی بقا معلوم۔ میری یہ باتیں اُنکے لئے وجہ تسلی نہ ہوئیں، خدا کرے اب یہ مقالہ اُن کے لئے عبرت کا سامان ہو اور وہ اپنی غیر روادانہ ذہنیت کے خطرناک نتائج محسوس کر سکیں۔

سید اختر علی تلہری

بیادگار مہاتما گاندھی

ماہ

بھائی رسالہ گورکھپور

سالانہ چندہ چار روپے ساجدی پریس گورکھپور نئی پریہ چھپے آنے

ایڈیٹر

فضل الرحمان عثمانی بی۔ اے

قول فیصل

(شیطان و شاعر کا مناظرہ)

ملک کے مشہور حقیقت نگار شاعر علی اختر اختر حیدر آبادی کی وہ معرکہ آلارا نظم جس میں کائنات کی تخلیق، خدا کی حقیقت، آفرینش انسان کے غایت پر بحث کرتے ہوئے قطعی و اذعانی دلایل سے مذہب و اخلاق کی ضرورت کو ثابت کیا گیا ہے۔ انکار خدا، تخفیف مذہب، اباحت اخلاق سکر و نشاط کے سلسلہ میں شیطان کے زبردست دلایل کا جواب جس بصیرت افروز انداز میں دیا گیا ہے وہ نہ صرف دنیائے شاعری بلکہ دنیائے علم و حکمت میں بھی آپ اپنی مثال ہے۔

فن شعر کے لحاظ سے یہ نظم ایسا معجزۂ ادب ہے جسکی نظیر آپ کو دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ نہایت نفیس کاغذ پر، مصنف کی تازہ تصویر کے ساتھ جلد شایع ہونے والی ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

ضرورت ہے رشتہ کی

ایک ۲۸ سال کے نوجوان کے لئے جو بمبئی میں معقول کاروبار کے مالک ہیں۔ لڑکی کا انگریزی تعلیم یافتہ ہونا اتنا ضروری نہیں، جتنا معقول اور سمجھدار ہونا ضروری ہے۔

خط و کتابت اس پتہ سے کیجئے :-

م - ذریعہ دفتر نگار۔ لکھنؤ

دلچسپ معلومات

کائنات کی عظمت

اگر آپ نے اندھیری رات میں کبھی آسمان کی طرف غور کیا ہوگا تو بیشمار چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ کر یقیناً کائنات کی وسعت کے خیال سے آپ پر حیرت طاری ہوئی ہوگی، لیکن آپ کی یہ حیرت اور بڑھ جائے اگر اس وسعت کے ادراک کے متعلق انسان کی بے بسی آپ پر ظاہر ہو جائے۔ آئیے آج آپ کو اپنی اسی مجبوری کا فسانہ سنائیں۔

آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ جتنے ستارے ہمکو نظر آتے ہیں وہ نصف آسمان کے ہیں، کیونکہ دوسرا نصف حصہ ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے، لیکن اسی نصف حصہ میں جتنے ستارے ہم کو دکھائی دیتے ہیں ان کی تعداد کا اندازہ ۳۵۰۰ کیا گیا ہے۔ لیکن اگر آپ دوربین سے دیکھیں تو یہ تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تک پہونچ جاتی ہے اور مونٹ ولسن کی رصد گاہ میں جو ۱۰۰ انچ والی دوربین قایم ہے اس کی مدد سے یہ تعداد ۵۰۰ ملین (ایک ارب ۵۰ لاکھ) ہو جاتی ہے، لیکن اس کے بعد بھی بیشمار ستارے ایسے رہجاتے ہیں، جہاں تک کسی بڑی سی بڑی دوربین کی رسائی ممکن نہیں۔

انسان اور ستاروں کا ساتھ بہت پرانا ہے۔ انسان عہد قدیم اور زمانۂ وحشت میں بھی ستاروں کو دیکھا کرتا تھا اور رفتہ رفتہ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ کیونکر ان کی مدد سے وہ صحراؤں اور کوہستانوں میں راہ پا سکتا ہے اور اس طرح اس نے مخصوص ستاروں کے مخصوص نام بھی رکھ لئے تھے اور ان پر رائے زنی بھی کرتا تھا۔ چنانچہ بطلیموس نے روشنی کے اعتبار سے ستاروں کی چھ قسمیں بتائیں، جو ستارہ سب سے زیادہ مدھم نظر آتا تھا اسے وہ چھٹی قسم میں شامل کرتا تھا اور روشن ترین ستارہ کو قسم اول یا قدر اول میں ستاروں کا رنگ دیکھ کر ان کے گرم یا ٹھنڈے ہونے پر بھی حکم لگایا جاتا تھا، یعنی جو ستارہ سُرخ ہوتا تھا اسے گرم خیال کیا جاتا تھا اور جو سفید نظر آتا تھا اسے ٹھنڈا سمجھا جاتا تھا، لیکن اب یہ معیار بالکل بدل گیا ہے اور جو ستارہ جتنا زیادہ سفید نظر آتا ہے اتنا ہی زیادہ گرم ہے۔ کیونکہ جب ایک چیز بہت زیادہ گرم ہو جاتی ہے تو اس کا رنگ سفید ہو جاتا ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اتنے ستاروں کی موجودگی سے فضا میں تنگی ہو گئی ہوگی، لیکن ان کروروں بلکہ اربوں ستاروں کے ہوتے ہوئے بھی فضا کی وسعت ایسی ہے جیسے تمام کرۂ ارض پر صرف چند مکھیاں پرواز کر رہی ہوں۔

جتنے ستارے ہم کو نظر آتے ہیں وہ صرف اس کہکشاں سے تعلق رکھتے ہیں جو ہم کو روز رات کو نظر آتی ہے، لیکن ماوراء کہکشاں جو وسعت پائی جاتی ہے اس کا اندازہ عقل انسانی کر ہی نہیں سکتی — آفتاب زمین سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دور ہے

اور ہمارے نظام شمسی میں بعید ترین ستارہ پلوٹو ہے جو سورج سے ایک ارب میل دور ہے۔ اس کے بعد خلا بسیط واقع ہے جو ہمارے نظام شمسی کو دوسرے نظاموں سے جدا کرتا ہے اور یہ خلا ۲۵۰۰۰۰۰۰ ملین میل سے کم نہیں۔

رات کو جو ہمیں چمکتے ہوئے ستارے نظر آتے ہیں یہ فضا کے بالکل ابتدائی حصہ میں واقع ہیں، ان سے بہت آگے کہکشاں ہے جو اندازاً ایک کھرب ستاروں کا مجموعہ ہے، اور اتنی دور واقع ہیں کہ ہم کو الگ نظر بھی نہیں آتے بلکہ پھیلی ہوئی روشنی کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ کہکشاں گویا ایک پہیہ ہے جو زمین سے ۵۰ ہزار نوری سال[1] کے فاصلہ پر گردش کر رہا ہے۔

سلسلۂ کہکشاں میں کم از کم دس کرور شمسی نظام پائے جاتے ہیں اور ان میں ہمارا نظام شمسی بھی شامل ہے جو بہت کمتر درجہ کا سمجھا جاتا ہے۔ ماورائے کہکشاں ستاروں کا اتنا عظیم الشان جھنڈ ہے کہ اس کا اندازہ ممکن ہی نہیں اور ان میں سے بعض کی روشنی زمین تک ۸۰ لاکھ سال میں پہونچے گی۔

لکھ پتیوں کی سیر گاہ

امریکہ میں ساحل میامی کی سیر و تفریح سے ہر شخص لطف اُٹھا سکتا ہے بشرطیکہ وہ لکھ پتی ہے۔ اگر آپ ۴۰ ڈالر روزانہ بستر کے لئے، ۲۰۰ ڈالر نہانے کے سوٹ کے لئے، ۳۰۰۰ ڈالر ایک ہاتھ سے رنگی ہوئی ٹائی کے لئے اور ۲۰ ڈالر لنچ کے لئے ادا کر سکتے ہیں تو آپ بھی میامی جا سکتے ہیں۔ یہاں قمار خانے، تصویر خانے اور میخانے تو ہونا ہی تھے، لیکن ان کے علاوہ عیش و نشاط اور لطف و مسرت کے اتنے اسباب و ذرائع مہیا ہیں کہ یہاں انسان ساری دنیا کو بھول کر جنت ارضی میں پہونچ جاتا ہے۔ اس ساحلی آبادی میں ۳۳۹ ہوٹل ہیں جن کے ۲۳۰۰۰ ہزار کمرے موسم میں کھچا کھچ بھر جاتے ہیں۔ اس مقام کو خوبصورت، صحت بخش اور دلچسپ بنانے کے لئے کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا گیا۔ اسکی آبادی صرف ۳۲ ہزار ہے جو سب کی سب سیاحوں کی دولت پر امیرانہ زندگی بسر کرتی ہے۔ یہاں کا موسم بڑے دن سے شروع ہو جاتا ہے اور دو تین مہینہ تک رہتا ہے، لیکن انھیں چند مہینوں میں ۲۲ ارب ڈالر کی کھیر یہاں ہو جاتی ہے۔

زمین سے ۷۰ میل اوپر

زمین سے ۱۲ میل کی بلندی پر درجۂ حرارت ۷۵ ڈگری کم ہو جاتا ہے، لیکن ۳۰ میل پر وہ ۱۱۰ ڈگری زیادہ ہو جاتا ہے، اس کے بعد ۵۰ میل کی بلندی پر وہ پھر ۷۵ ڈگری کم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہ پھر بڑھتا ہے۔ الغرض ۷۰ میل تک گھٹاؤ بڑھاؤ پایا جاتا ہے لیکن اس کے بعد درجۂ حرارت برابر بڑھتا ہی جاتا ہے، یہاں تک کہ ۷۰ میل کے بعد وہ درجۂ غلیان (اُبال) تک پہونچ جاتا ہے اور پھر اس میں کوئی کمی نہیں ہوتی بلکہ زیادتی ہی ہوتی جاتی ہے۔

---

[1] فلکیات میں چونکہ ریاضی کے اعداد کام نہیں دیسکتے، اسلئے ماہرین نے فاصلہ ظاہر کرنے کے لئے روشنی کی رفتار کو معیار مقرر کیا ہے۔ روشنی کی رفتار ایک کرور دس لاکھ میل فی منٹ ہے، اس لئے اگر کسی ستارہ کی روشنی ہم تک ایک سال میں پہونچتی ہے تو اس ستارہ کا بُعد ایک نوری سال ظاہر کیا جاتا ہے۔

نگار بک ایجنسی کی زیر طبع کتابیں

مکتوباتِ نیاز

تیسرا حصّہ

ادب و انشاء کا معجزہ، علمی و تنقیدی لطائف کا بیش قیمت مجموعہ، بہترین فارسی و اُردو اشعار کا گلدستہ ۲۸ پونڈ کا چکنا کاغذ، نہایت نفیس طباعت و کتابت، خوبصورت جلد اور گرد پوش، حضرتِ نیاز کی تصویر کے ساتھ ۱۵ ارجون تک شایع ہو جائے گا۔

قیمت چار روپیہ

علاوہ محصول

مالہ و ماعلیہ

حضرت نیاز کے ان تمام مقالات کا مجموعہ جن میں عصر حاضر کے اکابر شعراء کے کلام پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، ماہر القادری، اثر لکھنوی، وحشت کلکتوی، دل شاہجہانپوری، سیماب اکبرآبادی اور دیگر اکابر شعراء کے کلام پر تبصرہ کرکے اسکے محاسن و معائب کو پیش کیا گیا ہے۔ فن شعر سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بے مثل چیز ہے۔ زیر طبع ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

۴۲ء سے لیکر ۴۸ء تک کے

تمام استفسارات و جوابات کا مجموعہ

ایک ضخیم جلد میں

زیر طباعت ہے ... یہ گویا سیکڑوں صفحات کی انسائکلوپیڈیا ہے، جس میں علم و ادب، علم و تاریخ، مذہب، سائنس اور وقوعات عامہ کے ہزاروں معلومات درج ہیں اور جسکا ہر اہلِ قلم و شایقِ ادب کی میز پر ہونا ضروری ہے۔

قیمت بارہ روپیہ

ناول کیا ہے؟

فنی و تاریخی نقطۂ نظر سے

اگر آپ ناول سے لطف اُٹھانا چاہتے ہیں، اگر آپ کامیاب ناول نویس بننا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے جس میں ناول کی تاریخ، اس کے اجزاء ترکیبی اور پلاٹ و کردار وغیرہ کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع پر اُردو میں یہ دوسری کامیاب تصنیف ہے۔

قیمت تین روپیہ

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ، علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

۱ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲ مادیئن کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانۂ حُسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً:- مومن، ظفر غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوشش اصغر وغیرہ وغیرہ، دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جن کا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔

قیمت حصۂ اول للعہ - حصۂ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کردینے والی

انجیلِ انسانیت

"من ویزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے — اور جس میں مذاہب کی تحقیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے ——— ضخامت ۶۷۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنہ (۷/۸) علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶ "نگار" بک ایجنسی لکھنؤ

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء (مصحفی نمبر)
اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- حیات مصحفی - اُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ - مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں، انتخاب کلام مطبوعہ وغیر مطبوعہ
قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء (نظیر نمبر)
اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- نظیر کا مسلک شاعری پر تبصرہ - نظیر اور عوام - انتخاب کلام مطبوعہ وغیر مطبوعہ
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۱ء
یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے - یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے -
قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۲ء
اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری ۴۱ء میں شایع ہوا تھا -
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء
اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی -
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۵ء (قرآن نمبر) اس میں ڈاکٹر ٹشڈل کے اُن اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں - حضرت نیاز کے فٹ نوٹ اور استدراک کے ساتھ ——— قیمت دو روپیہ علاوہ محصول -

جنوری - فروری مارچ سنہ ۴۶ء یہ سالنامہ دو حصّوں میں شایع ہوا ہے اور فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے - پہلا حصّہ جنوری کا ہے اور دوسرے حصّہ میں فروری، مارچ دونوں نمبر شامل ہیں - قیمت ہر حصّہ کی ایک روپیہ آٹھ آنے

جنوری سنہ ۴۷ء اس سالنامہ کا نام "ماجدولین نمبر" ہے جس میں ایک بے مثل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے - ادبیت و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا ——— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے - علاوہ محصول -

جنوری، فروری سنہ ۴۸ء (پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر - جس میں دُنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دُور رس اور اُن کارناموں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومتوں کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی - تمام مقالات اڈیٹر کے قلم کے ہیں ——— قیمت تین روپیہ —— علاوہ محصول -

نرخنامہ اُجرت اشتہار

ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ ۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھ صفحہ ۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ ۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۴ روپیہ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر چھ روپیہ - ششماہی جاری نہیں ہوسکتا - سالانہ بیرون ہند بارہ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہوسکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا - "منیجر"

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے - "منیجر"

جواب کیلئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے

مطبوعہ مختار پرنٹنگ ورکس لکھنؤ - ایڈیٹر و پبلشر - ایس حسین (رضوی)